شیعہ خواتین کی

طلاق بذریعہ عدالت

آیت اللہ ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا و مولانا محمد

وآلہ الطیبین الطاھرین المعصومین

اس مضمون میں ہم طلاق کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ کا جائزہ لیں گے اور وہ مسئلہ ہے شیعہ خواتین کی طلاق بذریعہ عدالت۔ طلاق عقدِ نکاح کو ختم کرنے کا نام ہے۔ عقد ایک معاہدہ ہے جو مرد اور عورت کے درمیان ہوتا ہے اور طلاق اس معاہدے کو ختم کرنے کا نام ہے۔ اس لیے طلاق پر بات کرنے سے پہلے عقد اور معاہدوں کے حوالے سے کچھ بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے:

1۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے عقود پورے کرو۔ (مائدہ: 1)

اس آیت میں واضح الفاظ میں عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ عقود عقد کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ سب معاہدے ہیں جو اللہ اور انسان کے درمیان ہوں، دو انسانوں کے درمیان ہوں، دو خاندانوں کے درمیان ہوں، دو قوموں کے درمیان ہوں، یا بین الاقوامی سطح پر سب اقوام کے درمیان ہوں جیسا کہ عالمی قوانین اور بین الاقوامی معاہدے جن پر سب ممالک نے دستخط کیے ہوئے ہیں۔

چونکہ عقدِ نکاح بھی ایک عقد ہے، اس لیے اس آیت کی رو سے اس عقد کو پورا کرنا واجب ہے۔ بغیر کسی شرعی وجہ کے مرد عورت کو طلاق نہیں دے سکتا اور نہ ہی کسی شرعی وجہ کے بغیر عورت شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ کسی شرعی وجہ کے بغیر اگر مرد عورت کو طلاق دے یا عورت مرد سے طلاق لے تو طلاق تو ہو جائے گی لیکن مذکورہ بالا آیت کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ نکاح عقد تو ہے لیکن عام عقود کی نسبت بہت غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔کرایہ داری کا معاہدہ جسے فقہ میں عقدِ اجارہ کہا جاتا ہے، کسی عمارت یا چیز اور اس کے مقابل ادا کیے جانے والے کرائے کے بارے میں ہوتا ہے، مزارعت کا عقد زرعی زمین کے مالک اور کاشتکار کے درمیان ہوتا ہے، مشارکت کا عقد کاروبار میں دو یا دو سے زیادہ افراد کی مشارکت سے متعلق ہوتا ہے، اسی طرح دیگر عقود۔ لیکن عقدِ نکاح دو انسانوں کا مشترکہ زندگی گزارنے کا معاہدہ ہوتا ہے، اس عقد کے ذریعے دو انسان یعنی ایک مرد اور عورت ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن جاتے ہیں، ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دو انسان اس عقد کے ذریعے سے ایک دوسرے کے وجود کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ وہ پہلو ہے جو عقدِ نکاح کو ایک مقدس عقد بنا دیتا ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں عام طور پر یہ تصور اور رویہ پایا جاتا ہے کہ جب مرد کسی عورت سے شادی کر لیتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ عورت کی زندگی کا مالک اور حاکم مطلق بن گیا ہے اور عورت اس کی محکوم اور باندی بن گئی ہے، جسے شوہر کے ہر جائز و ناجائز حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور اسے شوہر کے کسی ظلم و زیادتی کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دوسرے تمام معاہدوں اور عقود میں، معاہدے اور عقد کا ایک فریق دوسرے فریق کا مالک، حاکم اور آقا نہیں بن جاتا، بالکل اسی طرح عقدِ نکاح سے مرد عورت کا مالک، حاکم اور خدا نہیں بن جاتا۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں اس حقیقت کو بری طرح سے نظر انداز کیا گیا ہے اور اس قسم کی حدیثیں بھی گھڑ لی گئی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہر گز نہیں فرمایا ہے۔

2۔اسلامی شریعت کے مطابق اسلامی احکام اور قوانین کے خلاف کوئی معاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کوئی معاہدہ کیا جائے تو وہ باطل ہوگا۔ مثال کے طور پر دو افراد کوئی ایسا کاروبار کرنے کا معاہدہ کریں جو شرعاً جائز اور حلال نہیں ہے، جیسے جوئے یا شراب کا کاروبار، یا معاہدہ عاقلانہ نہ ہو جیسا کہ کوئی شخص 50 لاکھ قیمت کا مکان 5 لاکھ میں بیچے تو چونکہ یہ معاملہ اور معاہدہ خلافِ عقل ہے اور وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہا ہے، تو یہ معاہدہ صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ کوئی بھی عقد یا معاہدہ کرتے وقت پہلے اس بات کو یقینی بنائے کہ جو معاہدہ وہ کرنے والا ہے وہ کسی شرعی حکم یا شرعی شرط کے خلاف نہ ہو۔

4۔اگر کوئی معاہدہ ہو جانے کے بعد معلوم ہو کہ اس میں کسی شرعی حکم یا شرط کی کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

5۔شرعی احکام اور شرائط کے مطابق انجام پانے والا ہر معاہدہ اور عقد واجب الوفا ہے۔ یعنی اس عقد اور معاہدے کو پورا کرنا واجب ہے۔ خواہ معاہدے کا دوسرا فریق کافر و مشرک ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَداً فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ

ترجمہ: جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے عہد پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کی مدد نہیں کی تو ان کا عہد ان کے عہد کی مدت تک پورا کرو، یقین جانو! اللہ متقین سے محبت کرتا ہے۔(توبہ:4)

6۔اگر کوئی عقد شرعی احکام اور شرائط کے مطابق صحیح ہو لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اس عقد کو جاری رکھنا بہت مشکل ہو جائے اور اسے پورا کرنے کی صورت میں دونوں یا کسی ایک فریق کی زندگی کے لیے واقعی بہت سنجیدہ قسم کی مشکلات اور مسائل پیدا ہو رہے ہوں، تو ایسی صورت میں صورتحال کی سنگینی کے لحاظ سے عقد کو ختم کر دینا جائز یا واجب ہو جائے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

ترجمہ: اللہ تمہارے لیے آسانی (یسر) چاہتا ہے تمہارے لیے مشکل (عسر) نہیں چاہتا۔(بقرہ:186)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ

ترجمہ: اور اللہ نے دین میں تم پر کوئی حرج مقرر نہیں کیا ہے۔(حج:78)

حرج تنگی اور گھٹن کو کہتے ہیں۔شریعت اسلامی میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کوئی بھی شرعی حکم جس پر عمل کرنا موجب عسر یا موجب حرج ہو،تو اس حکم کی پابندی واجب نہیں رہے گی اور اگر کسی حکم پر عمل کرنا باعث ضرر ہوتو اس حکم پر عمل کرنا حرام بھی ہوجائے گا۔جیسا کہ ماہ رمضان کا روزہ رکھنا عام حالت میں واجب ہے،لیکن بیماری کی حالت میں روزہ رکھنے سے بیماری میں اضافہ ہونے کا امکان ہو یا اس کے علاج میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا ہونے کا امکان ہوتو ایسے شخص پر رمضان کا روزہ رکھنا حرام ہوجائے گا۔خنزیر کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن اگر انسان ایسی صورت حال میں گرفتار ہوجائے کہ خنزیر کا گوشت نہ کھانے سے عسر،حرج یا ضرر والی صورت حال پیدا ہورہی ہوتو اس صورت میں خنزیر کا گوشت کھانا جائز یا واجب بھی ہوسکتا ہے۔بالکل اسی طرح اگر کسی عقد کو جاری رکھنے کے نتیجہ میں عسر وحرج کی صورت حال پیدا ہوجائے تو اس عقد کو جاری رکھنا واجب نہیں ہوگا اور اگر اس عقد کو جاری رکھنا کسی بھی لحاظ سے باعثِ ضرر ہوتو اس عقد کو جاری رکھنا حرام اور اس کو ختم کر دینا واجب ہوجائے گا۔

7۔مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق میں اس حکم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے:

فَإِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحٌۢ بِإِحۡسَٰنٍ

ترجمہ:معروف کے مطابق روکے رکھنا یا احسن انداز میں رخصت کر دینا۔ (بقرہ:229)

معروف کے معنی ہیں تسلیم شدہ طریقہ کار یا تسلیم شدہ اقدار(Recognised Values)،اور اس کی ضد ہے منکر، یعنی غیر تسلیم شدہ طریق کار یا غیر تسلیم شدہ اقدار۔اسلام کے مطابق معروف سے مراد شرعی،عقلی اور اخلاقی احکام ہیں۔اس آیت کے مطابق عورت کے معاملہ میں مرد کے سامنے صرف دو راستے ہیں کہ عورت کو رکھنا ہے تو معروف کے مطابق رکھے،معروف کے مطابق نہیں رکھ سکتا یا نہیں رکھنا چاہتا تو خوبصورت انداز میں اسے آزاد کر دے،عورت کی زندگی کو تلخ اور خراب کرنے کی نیت سے اسے نکاح کے بندھن میں باندھے رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے:

وَلَا تُمۡسِكُوهُنَّ ضِرَارٗا لِّتَعۡتَدُواْ

اور انہیں ضرر رسانی اور زیادتی کے لیے نکاح کے بندھن میں مت روکے رکھو۔(ایضاً)

انتہائی اہم نوٹ: اگر کوئی مرد اپنی بیوی کے حقوق ادا نہ کرے اور اس کے مطالبے کے باوجود اسے خلع بھی نہ دے اور اس حالت میں اسے اپنے قبضے میں رکھے تو اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے عورت کو حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حبس بے جا والی صورت بدترین ضرر کے زمرے میں آتی ہے۔اسلام نہ کسی کو یہ اجازت دیتا ہے کہ کسی کو حبس بے جا میں رکھے اور نہ کسی کو اجازت دیتا ہے کہ وہ حبس بے جا میں رہے۔

8۔اگر کسی معاہدے کا کوئی ایک فریق معاہدے کی یا معاہدے کی کسی شق یا شرط کی خلاف ورزی کرے تو دوسرے فریق پر اس معاہدے اور عقد کو پورا کرنا واجب نہیں رہتا اور اسے یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ اس معاہدے سے نکل آئے۔عقل سلیم،دنیا کے کسی ملک کا قانون اور اسلام کا قانون کسی شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ کسی ایسے معاہدے کو پورا کرے،کسی ایسے معاہدے کے بندھن میں بندھا رہے جس کی شرائط اور فرائض کو دوسرا فریق پورا نہ کر رہا ہو۔بنابریں:

(A) چونکہ نکاح ایک عقد ہے سورۂ مائدہ کی آیت 1 کے مطابق اس کو پورا کرنا مرد اور عورت دونوں پر واجب ہے۔کسی شرعی جواز کے بغیر مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دینا یا عورت کا مرد سے طلاق لینا جائز نہیں ہے۔جب شوہر اپنے سب فرائض احسن طریقے سے پورے کر رہا ہو،بیوی کے سب حقوق ادا کر رہا ہوتو عورت کو اس سے طلاق یا خلع لینے کا حق نہیں ہے۔اسی طرح اگر عورت اپنے سب فرائض احسن طریقے سے پورے کر رہی ہو اور شوہر کے حقوق احسن طریقے سے ادا کر رہی ہوتو شوہر اس کو طلاق نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ عقد کو پورا کرنا واجب ہے۔

(B) عقد کو پورا کرنے کے واجب ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں عقد کی رو سے عائد ہونے والی سب ذمہ داریوں کو احسن

طریقے سے پورا کریں اور ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کریں تا کہ عقد قائم رہے اور اس کے نتائج اور برکات حاصل ہوتے رہیں۔

(C) اگر عورت شوہر کے حقوق ادا کرنے میں دلچسپی نہ لے اور اپنے فرائض ادا کرنے سے پہلوتہی کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عقد نکاح کی بنیادی شرائط کی خلاف ورزی کی مرتکب ہورہی ہے۔ اگر معاملے کو سلجھانے کی کوششیں ناکام ہوجائیں تو شوہر اسے طلاق دینے کا حق رکھتا ہے۔

(D) اگر مرد نکاح کی رو سے عائد ہونے والی شرعی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے، بیوی کے معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور بنیادی انسانی حقوق پورے نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقد نکاح کی بنیادی شرائط کی خلاف ورزی کا مرتکب ہورہا ہے۔ اگر معاملے کو سلجھانے کی کوششیں ناکام ہوجائیں تو ایسی صورت میں عورت پر واجب نہیں ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر اس عقد کی پابندی کرے بلکہ مرد کی طرح اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس عقد کو ختم کر کے اس بندھن سے آزاد ہوجائے۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

ترجمہ: جیسے مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں معروف کے مطابق ویسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں اور مردوں کو (خاندان کا سربراہ ہونے کی وجہ سے) ان پر ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ (بقرہ:228)

بنابریں اگر مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر بیوی عقد زوجیت کی شرائط وفرائض کو پورا نہ کرے تو وہ اسے طلاق دے سکتا ہے اسی طرح اگر مرد عقد زوجیت کی رو سے عائد شرائط وفرائض کو پورا نہ کرے تو عورت کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اس معاہدے سے نکل جائے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب: اس مقام پر ایک شبہ بعض لوگوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ چار شادیاں کرے۔ کیا اس آیت کی رو سے عورت کو بھی چار شادیوں کا حق حاصل ہے؟

جواب: یہ آیت مرد اور عورت کے متقابل حقوق کی بات کر رہی ہے۔ مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ ایک مرد ہیں اور آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی تو بھی آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ یہ حق کسی عورت سے شادی کرنے کی وجہ سے آپ کو حاصل نہیں ہوا، اللہ نے اپنی طرف سے یہ حق مرد کو دے رکھا ہے۔ لیکن جب آپ کسی عورت سے عقد کر لیتے ہیں تو اس عقد کی وجہ سے آپ کو اس عورت پر کچھ حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔ اس عقد کی وجہ سے جیسے حقوق آپ کو اپنی بیوی پر حاصل ہوتے ہیں ویسے ہی حقوق عورت کو آپ پر حاصل ہوجاتے ہیں۔ یہ آیت ان حقوق کی بات کر رہی ہے جو عقد نکاح کی وجہ سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے پر حاصل ہوتے ہیں۔

بنابریں اگر مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر بیوی عقد نکاح کی شرائط اور فرائض کو پورا نہ کرے تو وہ اسے طلاق دے سکتا ہے تو اگر مرد عقد نکاح کی شرائط وفرائض کو پورا نہ کرے تو اس آیت کی رو سے عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس عقد نکاح سے آزاد ہوجائے۔ اگر مرد کا رویہ ایسا ہو کہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا باعث عسر وحرج ہو یا باعثِ ضرر ہو اور حالات ایسے ہوجائیں کہ مرد اور عورت اللہ کے احکام اور حدود کے مطابق ازدواجی زندگی بسر نہ کر سکیں، تو ایسی صورت میں عورت پر واجب ہے کہ وہ اس عقد سے باہر آجائے۔

ایسی صورت حال میں عقد سے باہر آنے کے لیے عورت کے سامنے یہ راستے کھلے ہیں:

1۔ عورت مرد سے خلع کا مطالبہ کرے۔

2۔ اگر مرد ایک شریف اور باضمیر انسان ہو تو عورت کے مطالبہ پر ضرور اسے خلع دے دے گا۔ اس لیے کہ کوئی شریف اور باضمیر مرد کسی ایسی عورت کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھنے پر تیار نہیں ہوگا جو دل سے اس کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو۔ لیکن اگر مرد عورت کے مطالبہ پر

اسے خلع نہ دے تو عورت خلع حاصل کرنے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کرسکتی ہے۔ عدالت کے ذریعے حاصل کردہ خلع بالکل درست ہے اور اس کے بعد کسی مولوی کے ذریعے نام نہاد شرعی طلاق حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

3۔ دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنے عسر وحرج یا ضرر والی صورتحال کو واضح کرکے خود عقدِ نکاح کے خاتمہ کا اعلان کرسکتی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سب مجتہدین نے فقہی کتب میں لکھا ہے کہ اگر مرد جماع کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو یا دیوانہ ہو تو عورت نکاح کو فسخ کر سکتی ہے یعنی بغیر طلاق کے نکاح کو ختم کرسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شوہر دوسرے حقوق ادا نہ کرسکتا ہو یا ادا نہ کرنا چاہتا ہو تو اس صورت میں بھی عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ نکاح کو ختم کردے۔ اس لیے کہ کسی کے جسمانی نقائص پر صبر کرنا بعض اوقات بہت آسان ہوتا ہے جب کہ اس کے برے اور ظالمانہ رویے اور اخلاقی نقائص (جو درحقیقت نفسیاتی بیماری اور پاگل پن کی ہی قسم ہوتے ہیں)، روز روز کے لڑائی جھگڑے اور جسمانی تشدد زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں عورت کو بطریق اولیٰ یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنی عسر وحرج یا ضرر والی کیفیت کو واضح کرکے اپنے نکاح کو ختم کرنے کا اعلان کردے۔ اسلام یا دنیا کا کوئی قانون کسی شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ کسی ایسے معاہدے کے بندھن میں بندھا رہے جس کے شرائط وفرائض کو دوسرا فریق پورا نہ کررہا ہو۔

آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی علیہ الرحمۃ کا فتوی:

بر هر زن متاهلی که زندگی اش در حال عسر است واجب است در صورت به نتیجه نرسیدن میانجیگری حکمین و پس از اثبات قطعی اعسارش نزد دو داور عادل، خود در انزد شهود عدلین طلاق دهد۔

ترجمہ: ہر شادی شدہ عورت جس کی زندگی حالتِ عسر میں ہو اور دو ثالثوں کی طرف سے اصلاح کی کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو، اس پر واجب ہے کہ عسر وحرج کی کیفیت کے بارے میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے دو عادل افراد کے سامنے اپنی عسر والی حالت کو ثابت کرنے کے بعد دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو طلاق دے دے۔ (رسالہ طلاق)

اس فتویٰ کے مطابق عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ اس پر واجب ہے، جی ہاں خود عورت پر واجب کہ عسر وحرج کی کیفیت کے بارے میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے دو عادل افراد کے سامنے اپنی عسر والی حالت کو ثابت کرنے کے بعد دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو طلاق دے اور اس نکاح کے خاتمہ کا اعلان کردے۔

عدالتی طلاق پر شیعہ مولوی صاحبان کا غلط موقف اور اس کے نتائج: عام طور پر شیعہ مولوی صاحبان کی طرف سے یہ موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شیعہ عورت عدالت کے ذریعے طلاق خلع حاصل کرلے تو یہ طلاق نہیں ہوتی اور عدالت کی طرف سے طلاق کا فیصلہ ہوجانے کے باوجود وہ عورت بدستور اسی شخص کی بیوی رہتی ہے جو عقد نکاح کے فرائض وشرائط کو پورا نہیں کررہا، جس سے خلع لینے کے لیے اس عورت نے عدالت سے درخواست کی ہوتی ہے۔ شیعہ علماء کا یہ موقف بالکل غلط اور غیر معقول ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

شیعہ علماء کے اس غلط موقف نے شیعہ خواتین کے لئے بہت سنگین مشکلات پیدا کردی ہیں اور ان کو بدترین قسم کے عسر وحرج اور ضرر سے دوچار کردیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی ایسی خواتین ہیں جن کے شوہر ان کے واجب یا جائز حقوق ادا نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں طلاق دیتے ہیں۔ اگر یہ خواتین عدالت کی طرف رجوع کرکے عدالت کے ذریعے طلاق خلع حاصل کرلیں تو مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ یہ طلاق درست نہیں ہے۔ آپ کسی مدرسے یا مسجد کے مولوی سے ''شرعی طلاق'' حاصل کریں۔ اگر کوئی عورت ابتداء ہی سے کسی مولوی کی ''پرائیویٹ عدالت'' سے طلاق حاصل کرلے، تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی، اس طلاق پر وہ نکاح ثانی نہیں کرسکتی کیونکہ شوہر کی طرف سے حدود کا مقدمہ قائم ہوجاتا ہے۔ اس طرح اس مظلوم عورت کو حکومتی عدالت اور مولوی کی پرائیویٹ عدالت کے دوہرے عمل کی تکلیف اور اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

میں ذاتی طور پر ایسے واقعات کو جانتا ہوں کہ ایک عورت کا شوہر اس کے حقوق ادا نہیں کر رہا تھا اور اسے طلاق بھی نہیں دیتا تھا۔ تنگ آ کر عورت نے عدالت سے طلاق لے لی۔ مرد نے دوسری شادی کر لی اور ہنسی خوشی اپنی زندگی میں مصروف ہو گیا، اس کے بچے بھی ہو گئے، بچے سکول بھی جانے لگ گئے لیکن عورت ابھی تک مولوی صاحبان کے اس غلط موقف کی وجہ سے عسر وحرج اور ضرر کی صلیب پر لٹکی ہوئی ہے، نہ جی رہی ہے نہ مر رہی ہے۔ ایک منٹ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ مولوی صاحبان کی بات درست ہے تو چونکہ اس کی وجہ سے خواتین کے لیے عسر وحرج اور ضرر والی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا اس پر عمل کرنا ضروری نہیں رہے گا، بالکل اسی طرح جس طرح یہ بات صحیح ہے کہ ماہ رمضان کا روزہ واجب ہے لیکن عسر وحرج اور ضرر کی صورتحال میں واجب نہیں رہتا اور حرام بھی ہو سکتا ہے، جس طرح خنزیر کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن عسر وحرج اور ضرر کی حالت میں جائز یا واجب ہو جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت طلاق لینا پسند نہیں کرتی اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں طلاق کو عورت کے لیے ایک داغ اور دھبہ سمجھا جاتا ہے۔ عورت طلاق کے لیے عدالت کی طرف اسی وقت رجوع کرتی ہے جب اس کی زندگی بدترین عسر وحرج اور ضرر والی کیفیت سے دوچار ہو چکی ہوتی ہے۔ اس صورت حال میں معمول کے شرعی احکام کے مطابق عمل کرنے پر اصرار کرنا شریعت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

مولوی صاحبان کے موقف کا تجزیہ:

اب آتے ہیں اس سوال کی طرف کہ ریاست کی قائم کردہ عدالتوں سے حاصل ہونے والی طلاق کیوں درست یا مؤثر نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب میں تین باتیں کہی جا سکتی ہیں:

1۔ چونکہ حکومت غیر شرعی ہے لہٰذا عدالتیں بھی غیر شرعی ہیں اور ان کے تمام فیصلے بھی غیر شرعی اور ناقابل قبول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دی ہوئی طلاق بھی درست نہیں ہے۔

2۔ چونکہ سرکاری عدالتوں کے جج صاحبان عادل نہیں ہیں لہٰذا ان کے فیصلے قابلِ قبول نہیں ہیں۔

3۔ طلاق کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان میں مخصوص الفاظ یعنی صیغے میں ہو۔ چونکہ عدالت کے ذریعے حاصل ہونے والی طلاق عربی کے مخصوص صیغوں میں نہیں ہوتی لہٰذا یہ طلاق صحیح نہیں ہے۔

ان تین باتوں میں سے اگر پہلی بات کو صحیح مان لیا جائے کہ چونکہ حکومت غیر شرعی ہے لہٰذا عدالتیں بھی غیر شرعی ہیں اور ان کے تمام فیصلے بھی غیر شرعی اور ناقابل قبول ہیں تو پھر صرف طلاق ہی نہیں بلکہ کسی بھی معاملے میں ان عدالتوں کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ کیا مساجد و مدارس پر دہشت گردی کے حملوں میں، مولوی صاحبان اور دیگر افراد ملت کے شہید یا زخمی ہونے پر خود مولوی صاحبان ان ہی عدالتوں کی طرف رجوع نہیں کرتے؟ انہی عدالتوں سے قاتلوں اور دہشت گردوں کو پھانسی دینے کا مطالبہ نہیں کرتے؟ اگر آپ کی زمین، مکان یا کسی اور ملکیت پر کوئی ناجائز قبضہ کر لے تو آپ کہاں جاتے ہیں؟ کسی مدرسے یا مسجد کے مولوی کی پرائیویٹ عدالت میں یا حکومت کی قائم کردہ عدالت میں؟ اگر کسی شخص نے آپ کو کوئی ادائیگی کرنی ہو اور وہ آپ کو ایک چیک دے دے، آپ چیک لے کر بنک جائیں اور چیک کیش ہونے کی بجائے ڈس آنر ہو جائے تو آپ کہاں جاتے ہیں؟ کسی مدرسے یا مسجد کے مولوی کی پرائیویٹ عدالت میں یا حکومت کی قائم کردہ عدالت میں؟ سڑک کے کنارے چلتی ہوئی کسی خاتون کا پرس کوئی غنڈہ چھین کر لے جائے تو وہ کہاں جائے گی؟ پولیس سٹیشن یا مولوی کی خودساختہ پرائیویٹ عدالت میں؟ ایسے کسی معاملے میں آپ تجربے کے طور پر کسی مسجد یا مدرسے کے مولوی کی خودساختہ پرائیویٹ عدالت میں جا کر دیکھیں، وہ خود آپ سے کہے گا کہ میرے پاس کیا لینے آئے ہو، جاؤ پولیس میں رپورٹ کرواور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ میں خود ایک ایسے شیعہ مولوی صاحب کو جانتا ہوں جن کا زمین کے معاملے میں اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ جھگڑا چل رہا تھا اور وہ اس کا مقدمہ حکومت کی قائم کردہ عدالت میں لڑ رہے تھے۔ لاہور کی ایک شیعہ مسجد کی انتظامی کمیٹی میں شدید اختلافات ہو گئے تو یہ معاملہ بھی انہیں حکومت کی عدالت میں لے جانا پڑا۔

کس قدر مضحکہ خیز بات ہے اور کیسی عجیب منافقت ہے کہ مولوی صاحبان کی درخواست پر یہ عدالتیں کسی قاتل یا دہشت گرد کو پھانسی دے دیں تو ٹھیک ہے لیکن ظالم شوہر کی ستائی ہوئی کسی مظلوم عورت کو خلع دے دیں تو وہ ٹھیک نہیں ہے۔ سب لوگ حتیٰ کہ خود مولوی صاحبان اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے حکومت کی قائم کردہ عدالتوں میں جاتے ہیں، لاشیں لے کر دھرنے دیتے ہیں، حکومت اور عدلیہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ قاتلوں کو گرفتار کر کے پھانسی دے لیکن عقد نکاح کی شرائط و فرائض ادا نہ کرنے والے غیر ذمہ دار اور ظالم شوہر کی ستائی ہوئی مظلوم عورت سے کہتے ہیں کہ سرکاری عدالت میں نہ جاؤ ہماری پرائیویٹ عدالت میں آؤ۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ چونکہ ریاستی عدالتوں کے جج صاحبان عادل نہیں ہوتے لہٰذا ان کے فیصلے قابلِ قبول نہیں ہیں تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اس صورت میں بھی کسی کو کسی بھی مسئلہ میں ان عدالتوں کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہئے۔ اس معاملے کو صرف عورت کے خلع لینے تک کیوں محدود رکھا جائے۔ سب لوگ، حتیٰ کے خود مولوی صاحبان سب معاملات میں ریاستی عدالت کے ''غیر عادل'' جج صاحبان کی عدالت میں جائیں لیکن ظالم شوہر کے ظلم و ستم کی چکی میں پسنے والی مظلوم عورت کی باری آئے تو جج صاحبان غیر عادل اور ان کا فیصلہ غیر شرعی!! مزید یہ کہ جہاں تک عادل ہونے کا تعلق ہے تو حکومتی عدالتوں کے بہت سے جج صاحبان بہت سے مولوی صاحبان زیادہ عادل ہوتے ہیں۔ ان سے بہتر نہ بھی ہوں تو ان سے بدتر نہیں ہوتے۔ نہ ہی سارے جج صاحبان کرپٹ اور بے ایمان ہوتے ہیں اور نہ ہی سب مولوی اور مجتہد عادل اور ایماندار ہوتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ طلاق عربی زبان کے مخصوص الفاظ (صیغے) میں ہو، تو یہ ضروری نہیں ہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

صیغہ طلاق: شیعہ فقہا کی بھاری اکثریت اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ طلاق صرف طَالِقٌ کے لفظ سے ہوگی۔ مرد اپنی بیوی کو مخاطب کر کے صحیح عربی لہجہ میں یہ الفاظ کہے: اَنْتِ طَالِقٌ، یا اس کا نام لے کر کہے زوجتی فلانۃ طَالِقٌ یا مرد کا وکیل یہ کہے کہ زوجۃ موکلی فلانۃ طَالِقٌ۔ اس کے علاوہ کسی بھی لفظ سے دی گئی طلاق، طلاق ہی نہیں ہوتی۔ لیکن شیعہ علما کا یہ فتویٰ بالکل غلط ہے اور اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

سب سے پہلے لفظ صیغہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ صیغہ اس خاص عبارت کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی بات بالکل دوٹوک اور صریح الفاظ میں بیان کر دی جائے کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ بنابریں صیغہ طلاق سے مراد ایسی عبارت یا جملہ ہے جس سے یہ بات واضح ہو جائے کہ مرد نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ وہ جملے اور الفاظ جن میں مطلب واضح نہ ہو اور ایک سے زیادہ مطلب نکلنے کا امکان ہو اسے صیغہ نہیں کہیں گے۔ چونکہ طلاق ایک انتہائی حساس اور اہم معاملہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسے ایسے جملے یا عبارت میں بیان کیا جائے جس سے یہ بات سو فیصد واضح ہو جائے کہ مرد نے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔

محمد بن مسلم روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا:

انت علی حرام او بائنۃ او بتۃ او بریۃ او خلیۃ۔ قال: ھذا کلہ لیس بشیئ، انما الطلاق ان یقول لھا فی قبل العدۃ بعد ما تطھر من محیضتھا قبل ان یجامعھا: انت طالق او اعتدی، یرید بذالک الطلاق و یشھد علی ذالک رجلین عدلین

ترجمہ: تو مجھ پر حرام ہے، یا مجھ سے جدا ہے، مجھ سے بے تعلق ہے، مجھ سے آزاد ہے، مجھ سے فارغ ہے تو کیا اس سے طلاق ہو جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ان الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ طلاق یہ ہے کہ مرد عورت کے حیض سے پاک ہونے کے بعد اس سے جماع کرنے سے پہلے یہ کہے: تو طالق (طلاق یافتہ) ہے یا یہ کہے کہ: اپنی عدت شروع کر لو اور اس سے اس کی مراد طلاق ہو، اور اس پر دو عادل گواہوں کی گواہی ڈال دے۔ (کافی 69:6)

تشریح: جن الفاظ کا سائل نے ذکر کیا وہ الفاظ طلاق پر واضح دلالت نہیں کرتے اس لیے امام علیہ السلام نے فرمایا کہ ان الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پھر امام علیہ السلام نے دو ایسے الفاظ بیان کیے جن کی طلاق پر دلالت واضح ہے۔ طَالِقٌ اور اِعْتَدِّیْ۔ لفظ طالق کی طلاق پر دلالت واضح ہے۔ اِعْتَدِّیْ یعنی اپنی عدت شروع کر لو کے الفاظ بھی طلاق پر واضح دلالت کرتے ہیں اس لیے کہ عورت پر عدت دو صورتوں میں واجب ہوتی ہے کہ یا تو

شوہر کی موت واقع ہو جائے، اس صورت میں عدتِ وفات واجب ہوتی ہے یا شوہر اسے طلاق دے دے تو اس صورت میں اس پر عدتِ طلاق واجب ہوتی ہے۔ جب شوہر یہ کہے کہ عدت شروع کرلو تو ظاہر سی بات ہے کہ اس سے عدتِ وفات مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ زندہ سامنے کھڑا ہے اور اس سے یہ الفاظ کہہ رہا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس صورت میں عدتِ طلاق ہی مراد ہوسکتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس حدیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی کہ ان الفاظ کو صحیح عربی میں کہنا ضروری ہے۔ آئمہ کی اور ان کے معاشرے کے لوگوں کی زبان عربی تھی، وہ ساری بات چیت عربی میں کرتے تھے۔ بلکہ اگر وہ کسی ایرانی سے فارسی میں کوئی بات کرتے تھے تو راویان حدیث نے اس کا ذکر بھی عربی میں ہی کیا ہے۔ اگر ان الفاظ کا عربی میں کہنا ضروری ہوتا تو امام علیہ السلام یہ ضرور فرماتے کہ یہ الفاظ عربی میں کہنے ضروری ہیں۔ اگر احادیث کے ان الفاظ کا یہ مطلب لیا جائے کہ یہ بات عربی میں ہی کہنی ہے تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

عن سماعه سئلته عن المختلعة فقال لا يحل لزوجها ان يخلعها حتى تقول لا ابر لك قسما ولا اقيم حدود الله فيك ولا اغتسل لك من جنابة ولا وطئن فراشك ولا دخلن بيتك من تكره من غير ان تعلم ۔۔۔

ترجمہ: سماعہ کہتے ہیں کہ میں نے امام علیہ السلام سے خلع لینے والی عورت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے شوہر کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اسے خلع دے جب تک کہ عورت اس سے یہ نہ کہے کہ میں تیری کسی قسم پر عمل نہیں کروں گی (یعنی اگر تم مجھے کسی کام کی قسم دوگے تو بھی میں وہ کام نہیں کروں گی)، تمہارے بارے میں اللہ کے کسی حکم پر عمل نہیں کروں گی، تم سے غسل جنابت نہیں کروں گی، اور تمہارے علم میں لائے بغیر تمہارے گھر میں اور تمہارے بستر پر ایسے شخص کو لے آؤں گی جسے تم ناپسند کرتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (کافی جلد 6 صفحہ 140)

کیا اس حدیث سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ میاں اور بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور بیوی خلع لینا چاہے تو ضروری ہے کہ بیوی صحیح عربی تلفظ کے ساتھ ان ہی الفاظ میں جھگڑا کرے تو اس کو خلع دینا جائز ہے۔ اگر ان الفاظ کے علاوہ کسی اور لفظ میں جھگڑا کرے، یا عربی کے سوا کسی اور زبان میں جھگڑا کرے اور ایسی ہی یا اس سے بھی شدید نفرت کا اظہار کرے تو کیا اس صورت میں خلع جائز نہیں ہوگی؟ کیا اس حدیث کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب عورت شوہر سے لڑائی جھگڑا کرنے کے لیے بھی کسی مولوی کو اپنا وکیل بنائے جو اس کی طرف سے صحیح عربی لہجے میں صرف ان ہی الفاظ میں شوہر سے لڑائی جھگڑا کرے۔ کیا اس حدیث کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب جھگڑے کے صیغے بھی مولوی صاحبان سے پڑھوائے جائیں گے ورنہ جھگڑا عام جھگڑا تو ہوگا لیکن ''شرعی جھگڑا'' نہیں ہوگا؟

بہرحال مذکورہ بالا حدیث کی رو سے جس طرح بیوی کو کسی بھی زبان میں اَنْتِ طَالِقٌ کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے اسی طرح کسی بھی زبان میں اِعْتَدِّیْ (اپنی عدت شروع کرلو) کہنے سے بھی طلاق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس بات پر اصرار کرنا کہ طلاق صحیح عربی لہجہ میں اَنْتِ طَالِقٌ کہنے سے ہی ہوگی ایک بے جا اصرار اور بے جا ضد کے سوا کچھ نہیں۔ شیخ یوسف بحرانی نے اپنی کتاب الحدائق الناظرہ (جلد 25 صفحہ 202) میں نقل کیا ہے کہ شہید ثانیؒ اپنی کتاب المسالک میں قائل ہوئے ہیں کہ اِعْتَدِّیْ (اپنی عدت شروع کرلو) سے طلاق ہو جانے کا لازمہ یہ ہے کہ طلاق پر واضح دلالت کرنے والے سب کنایات سے طلاق ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس حدیث کو بھی دیکھ لیجیے:

عن اسحاق بن عمار عن ابی عبدالله علیه السلام فی رجل طلق امراته ثلاثا فاراد رجل ان یتزوجها، فیکف یصنع؟ فقال: یدعها حتیٰ تحیض و تطهر ثم یاتیه و معه رجلان شاهدان فیقول: اطلقت فلانة؟ فاذا قال: نعم ترکها ثلاثة اشهر ثم خطبها الی نفسه

ترجمہ: اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر کوئی شخص اس عورت

سے شادی کرنا چاہے تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا: کہ اسے چھوڑ دے، یہاں تک کہ اسے حیض آجائے اور پھر وہ حیض سے پاک ہو جائے۔ پھر وہ شخص دو گواہوں کے ساتھ اس کے پاس جائے اور اس سے کہے: کیا تو نے فلاں (یعنی اپنی بیوی) کو طلاق دے دی؟ جب وہ کہے کہ ہاں تو پھر تین ماہ انتظار کرے اور پھر اپنے لیے اس کا رشتہ طلب کرے۔ (کافی جلد 5 صفحہ 424)

تشریح: اس روایت میں امام علیہ السلام سے پوچھا جا رہا ہے کہ ایک اہل سنت مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ اب کوئی شیعہ مرد اس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ کیا کرے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس اہلسنت مرد کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد انتظار کیا جائے کہ وہ عورت حیض دیکھے اور اس کے بعد حیض سے پاک ہو جائے۔ جب وہ پاک ہو جائے تو پھر وہ شیعہ مرد جو اس کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنا چاہتا ہے دو مردوں کو اپنے ساتھ لے کر اس اہل سنت مرد کے پاس جائے اور ان دو گواہوں کی موجودگی میں اس سے پوچھے: کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی؟ پھر جب وہ کہہ دے کہ ہاں تو اس کے بعد تین ماہ انتظار کرے اور پھر اس عورت سے شادی کر لے۔

ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

سکونی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے، انہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے، انہوں نے امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی کہ:

عن رجل یقال لہ طلقت امراتك؟ فیقول نعم۔ قال: قد طلقھا حینئذ

ترجمہ: امیر المومنین علیہ السلام سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس سے کہا گیا: کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی؟ وہ جواب دیتا ہے: ہاں۔ آپ نے فرمایا: پس اس نے اس وقت طلاق دے دی۔ (تہذیب الاحکام جلد 8، صفحہ 38 باب احکام اطلاق حدیث 30)

ان دونوں احادیث میں طَالِقٌ اور اِعْتَدِّيْ دونوں لفظ نہیں ہیں۔ بلکہ اس حدیث کے مطابق طلاق کے بارے میں سوال کے جواب میں نعم کہہ دینے سے طلاق ہو گئی۔ یہ صورت حال عرب معاشرے کے علاوہ کسی اور معاشرے میں بھی رونما ہو سکتی ہے جہاں کے لوگ عربی کے سوا کوئی اور زبان بولتے ہوں۔ مثلاً امریکہ میں ایک اہل سنت مرد نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور پھر ایک شیعہ مرد اس عورت سے شادی کرنا چاہے تو اس روایت کے مطابق وہ دو مردوں کو ساتھ لے کر اس شخص کے پاس جا کر جب پوچھے گا کہ کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی؟ ظاہر سی بات ہے کہ وہ عربی میں تو نہیں پوچھے گا، بلکہ انگریزی میں ہی پوچھے گا؟ پاکستان میں ہو تو اردو میں یا پھر اپنی علاقائی زبان پنجابی، بلوچی، پشتو، سرائیکی اور سندھی میں ہی سوال کرے گا اور جواب بھی اسی زبان میں ہوگا۔ امام علیہ السلام کے اس ارشاد کے مطابق جب وہ سوال کے جواب میں نعم، جی ہاں، yes یا کوئی اور لفظ کہے گا جو نعم کے ہم معنی ہو تو طلاق ہو جائے گی۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی زبان میں سوال کرنے اور اس کے جواب میں کوئی بھی لفظ جو نعم (جی ہاں) کا ہم معنی ہو، کہنے سے طلاق ہو جائے گی۔ اس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ کسی بھی زبان میں طلاق پر دلالت کرنے والے واضح الفاظ کے ساتھ طلاق دی جائے تو وہ طلاق ہو جاتی ہے۔

اگر قرآنی آیات کو دیکھا جائے تو سورۂ طلاق کی ابتدا ہی اس جملے سے ہو رہی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

ترجمہ: اے نبی! جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دو۔

اس آیت میں واضح طور پر طَلَّقْتُمُ اور طَلِّقُوهُنَّ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ طَلَّقْتُكِ (میں نے تجھے طلاق دے دی) یا اَنْتِ مُطَلَّقَةٌ (تو مطلقہ یعنی طلاق یافتہ ہے) تو اس آیت کی رو سے طلاق ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں استعمال شدہ الفاظ کی طلاق پر دلالت واضح ترین دلالت ہے۔ اس سلسلے میں مزید بات کرنے کی بہت گنجائش موجود ہے لیکن چونکہ ہم اس مقالہ کو مختصر رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا

اتنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا:

کل طلاق بکل لسان فھو طلاق

ترجمہ: ہر طلاق جو کسی بھی زبان میں دی جائے طلاق ہے۔ (تہذیب الاحکام جلد 8، باب احکام الطلاق حدیث 31)

مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ طلاق کا عربی کے مخصوص الفاظ (عربی صیغوں) میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اصرار بالکل لغو اور بے بنیاد ہے کہ جب تک عربی کے مخصوص صیغے نہ پڑھے جائیں طلاق نہیں ہوتی۔ نکاح و طلاق کا تعلق انسانی معاملات سے ہے جنہیں ان کی اپنی زبان کے ایسے الفاظ میں انجام دینے کی مکمل اجازت ہے جن کی دلالت واضح اور صریح ہو۔ اس دنیا میں چھ ہزار سے زائد زندہ زبانیں بولی جاتی ہیں اور تقریباً ہر بڑی زبان سے تعلق رکھنے والے مسلمان اور شیعہ پائے جاتے ہیں۔ ان سب سے یہ اصرار کرنا کہ طلاق صرف عربی زبان کے لفظ اَنْتِ طَالِقٌ سے دینی ہے، ورنہ طلاق نہیں ہوگی، ایک لغو اور بے ہودہ بات سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ خوش قسمتی سے آیت اللہ سیستانی بھی کسی حد تک ہمارے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ ان کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے:

اگر مرد عربی میں صیغہ نہ پڑھ سکتا ہو اور وکیل بھی نہ بنا سکے تو وہ جس زبان میں چاہے ہر اس لفظ کے ذریعے طلاق دے سکتا ہے جو عربی لفظ کے ہم معنی ہو۔

(توضیح المسائل، جامعہ تعلیمات اسلامی، 2008، مسئلہ 2472)

خلع کے صیغے: یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صیغوں کی مذکورہ بالا بحث کا تعلق اس صورت سے ہے جب شوہر بیوی کو ناپسند کرے اور اسے طلاق دے، چاہے خود طلاق دے یا اپنے وکیل کے ذریعے طلاق دے۔ لیکن خلع کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ خلع کے لیے شوہر کا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے تمہیں خلع دے دی۔ مثال کے طور پر عورت شوہر سے کہے کہ میں نے اپنا مہر تمہیں واپس کرتی ہوں تم مجھے خلع دے دو۔ پھر جب وہ عورت حالت حیض میں نہ ہو، اور اس طہر میں ہو جس میں مباشرت نہ کی ہو اور دو عادل گواہوں کی موجودگی میں شوہر کہہ دے کہ میں نے تمہیں خلع دے دی تو خلع ہو جاتی ہے۔ خلع کے بعد طلاق کے صیغے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اگر عورت کے مطالبہ پر مرد اسے خلع نہ دے تو عورت عدالت سے رجوع کرے گی اور عدالت کی دی ہوئی خلع بھی بالکل صحیح ہے اور خلع کے بعد طلاق کے صیغوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عدالت سے خلع لینے والی خاتون کو اس بات میں الجھانا کہ طلاق کے صیغے نہیں پڑھے گئے نہ صرف یہ کہ ایک بے ربط، غیر معقول اور انتہائی جاہلانہ بات ہے بلکہ بد دیانتی اور عورت پر ظلم ہے۔

صیغوں کے حوالے سے اہم نکتہ: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح یا طلاق کے صیغے صحیح عربی تلفظ کے ساتھ پڑھے جانے ضروری ہیں ورنہ نکاح نہیں ہوگا اور طلاق بھی نہیں ہوگی۔ اس بات کا مقصد عام مومنین کو مولوی صاحبان کا محتاج بنائے رکھنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ عام مومن تو صحیح عربی تلفظ کے ساتھ صیغے پڑھ ہی نہیں سکتا لہٰذا لامحالہ مولوی صاحب کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح مولوی صاحبان کی آمدنی کا دروازہ بھی کھلا رہے گا اور مومنین پر ان کی گرفت بھی مضبوط رہے گی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب مومنین کسی مولوی کو نکاح پڑھنے کے لیے بلاتے ہیں یا کسی مولوی سے طلاق کے صیغے پڑھواتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب صحیح عربی تلفظ کے ساتھ صیغے پڑھ رہے ہیں۔ میں ایک شادی میں لڑکی والوں کی طرف سے بطور مہمان شریک تھا۔ نکاح پڑھنے کے لیے لڑکے والے اپنے فیملی مولوی کو ساتھ لائے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے جب صیغے پڑھنے شروع کیے تو معلوم ہوا کہ عربی تلفظ بھی بالکل غلط اور صیغے بھی غلط۔ مولوی صاحب نے وہ صیغے پڑھ دیئے جو مرد نے پڑھنے ہوتے ہیں۔ یعنی مولوی صاحب نے مرد کے وکیل کے طور پر نکاح کے صیغے پڑھنے کی بجائے مرد کے طور پر صیغے پڑھے، یعنی دلہن کا اپنے ساتھ نکاح کر دیا۔ بعد میں میں نے اس بات کا ذکر احباب کی ایک محفل میں کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ احباب بھی ایسے ہی واقعات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

نکاح پڑھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے: ہم یہاں پر مومنین کرام کو واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتے ہیں کہ نکاح پڑھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔ اگر دولہا دلہن سے کہے کہ "میں نے اتنے مہر پر تم سے نکاح کر لیا یا یہ کہے کہ میں نے اتنے مہر پر تمہیں اپنی زوجیت میں لے لیا" اور دلہن کہے:

''میں نے قبول کرلیا'' تو نکاح ہوجاتا ہے۔اس سے پہلے **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ الحمد للہ رب العالمین ۔اللھم صل علی محمد و آل محمد** پڑھ لیں تو اللہ کے نام، اللہ کی حمد اور محمد و آل محمد علیہم السلام پر صلوات کی برکت بھی اس میں شامل ہوجائے گی۔آخر پر ایک بار پھر صلوات پڑھ لیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ بات مومنین کو سمجھ آنا شروع ہوگئی ہے اور کچھ شادیاں ایسی ہوئی ہیں جن میں دولہا اور دلہن نے خود مندرجہ بالا طریقے سے ایجاب وقبول کیا اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔امید ہے کہ جیسے جیسے مومنین کو اس بات کی سمجھ آتی جائے گی یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا جائے گا۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ عام طور پر نکاح پڑھتے وقت جو ایجاب عورت کی طرف سے اور قبول مرد کی طرف سے کیا جاتا ہے وہ ضروری نہیں ہے۔مرد اور عورت میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی ایجاب اور دوسرے کی طرف سے قبول ہوسکتا ہے۔ایک مرد اور عورت کے درمیان نکاح قائم کرنے کو **اِنکاح** اور رشتہ زوجیت قائم کرنے کو **تزویج** کہتے ہیں۔ان دونوں افعال کے بعد دو مفعول آتے ہیں جنہیں مفعول اول اور مفعول دوم کہا جاتا ہے۔نکاح پڑھنے والے مولوی صاحبان عام طور پر اس طرح نکاح پڑھتے ہیں:

اَنْکَحْتُ	مُوَکِّلَتِیْ	مُوَکِّلِیْ
میں نے نکاح کر دیا	اپنی موکلہ یعنی عورت کا	اپنے موکل یعنی مرد سے
زَوَّجْتُ	مُوَکِّلَتِیْ	مُوَکِّلِیْ
میں نے تزویج کر دیا	اپنی موکلہ یعنی عورت کو	اپنے موکل یعنی مرد سے

اس طرح فعل اَنْکَحْتُ اور زَوَّجْتُ کے بعد مفعول اول عورت اور مفعول دوم مرد ہوتا ہے۔اس طرح نکاح ہوجاتا ہے اور نکاح بالکل صحیح ہوتا ہے۔
اس کے برعکس ان جملوں کو اس طرح بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور میں جب کبھی نکاح پڑھتا ہوں تو ان جملوں کو اسی ترتیب سے پڑھتا ہوں اس لیے کہ یہ قرآن کے مطابق ہے:

اَنْکَحْتُ	مُوَکِّلِیْ	مُوَکِّلَتِیْ
میں نے نکاح کر دیا	اپنے موکل یعنی مرد کا	اپنی موکلہ یعنی عورت سے
زَوَّجْتُ	مُوَکِّلِیْ	مُوَکِّلَتِیْ
میں نے تزویج کر دیا	اپنے موکل یعنی مرد کو	اپنی موکلہ یعنی عورت سے

اس ترتیب کے مطابق مفعول اول مرد اور مفعول دوم عورت کو رکھا جاتا ہے۔اس ترتیب کو قرآن کے مطابق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ان دونوں جملوں کی یہی ترتیب ہے۔اس سلسلہ میں یہ دو آیات ملاحظہ فرمائیں۔جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے اور حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کے کردار، سچائی اور ایمانداری کو دیکھ کر اپنی ایک بیٹی سے ان کی شادی کرنے کا ارادہ کیا تو ان سے کہا:

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ	اَنْ اُنْکِحَکَ	اِحْدَی ابْنَتَیَّ ھٰتَیْنِ	(قصص 27)
میں چاہتا ہوں	نکاح کر دوں تمہارا	اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ۔	

اس آیت میں واضح طور پر مرد کو مفعول اول اور عورت کو مفعول دوم رکھا گیا ہے۔

دوسری آیت ملاحظہ فرمائیں: جب رسول اللہ کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ نے اپنی بیوی زینب بنت جحش کو جو رسول اللہ کی پھوپھی زاد تھیں، طلاق دے دی اور بعد میں وہ رسول اللہ کی زوجیت میں آگئیں تو اس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہے:

فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا	زَوَّجْنٰکَھَا	(احزاب 37)
پھر جب زید نے اس سے اپنی ضرورت پوری کر لی (یعنی اسے طلاق دے دی) تو	ہم نے تزویج کر دیا آپ کو اس کے ساتھ۔	

اس جملے میں بھی مرد کو مفعول اول اور عورت کو مفعول دوم رکھا گیا ہے۔

بنابریں جس ترتیب سے عام طور پر مولوی صاحبان نکاح پڑھتے ہیں وہ ضروری اور واجب نہیں ہے۔ اگرچہ نکاح اس سے بھی بالکل صحیح ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ قرآنی ترتیب کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں نکاح پڑھتے وقت، یعنی ایجاب وقبول کرتے وقت اس زبان کی اپنی ساخت اور گرائمر کے لحاظ سے کوئی بھی جملہ ادا کیا جاسکتا ہے جو اس مطلب پر واضح دلالت کرتا ہو۔

نکاح کے ضمن میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ نکاح میں ضروری نہیں کہ ایجاب فعل ماضی کے صیغے کے ساتھ کیا جائے۔ بلکہ فعل مضارع کے صیغے کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے، اور قبول کے لیے ضروری نہیں ہے کہ قَبِلْتُ کا لفظ ہی استعمال کیا جائے، بلکہ رَضِيْتُ یا نَعَمْ کے الفاظ بھی استعمال ہوسکتے ہیں۔ زبان سے ایجاب وقبول کی بجائے تحریری ایجاب وقبول بھی بالکل درست ہے۔ نکاح نامہ میں جہاں دلہن کے دستخط ہوتے ہیں اگر اس سے اوپر ایک لائن میں یہ لکھ دیا جائے کہ میں نے کالم نمبر دو میں مذکور دولہا کو اپنا شوہر قبول کرلیا، اسی طرح جہاں دولہا کے دستخط ہوتے ہیں اس سے اوپر ایک لائن لکھ دی جائے کہ میں نے کالم نمبر چار میں مذکورہ دلہن کو اپنی زوجہ قبول کرلیا، تو یہ بالکل درست ہے اور اس کے بعد لفظی صیغے پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

☆☆☆

مجتہدین کی دی ہوئی طلاق: جہاں تک مجتہد یا اس کے نمائندے سے طلاق لینے کا تعلق ہے تو یہ بالکل غلط، سراسر لغو اور بے بنیاد بات ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور مجتہد یا اس کے نمائندے کی دی ہوئی طلاق سرے ہوتی ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ:

1۔ عام حالات میں اور عام ضابطے کے مطابق طلاق یا خلع دینے کا اختیار مرد کو ہے۔

2۔ مرد کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی کو اپنی طرف سے طلاق یا خلع کا وکیل بنادے۔ مثلاً ایک شخص کسی بھی شخص کو یہ کہہ سکتا ہے کہ تم میری طرف سے وکیل ہو کہ میری بیوی کو میری طرف سے طلاق دے دو یا خلع دے دو۔ مرد کا وکیل اس کی طرف سے اس کی بیوی کو طلاق یا خلع دے دے تو طلاق یا خلع ہوجاتی ہے۔ مرد اپنی بیوی کو بھی طلاق یا خلع کی وکالت دے سکتا ہے۔

3۔ مرد اور عورت دونوں کسی تیسرے فریق کے پاس جاتے ہیں اور اس سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے مسائل حل نہیں ہورہے، آپ ہمارا مسئلہ دیکھیں اور جو مناسب سمجھیں فیصلہ کردیں، حتیٰ کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو طلاق کا فیصلہ بھی دے سکتے ہیں۔ اس صورت میں تیسرا فریق، خواہ وہ ان کے خاندان کا کوئی بڑا ہو، معاشرے کا کوئی معزز ہو یا جو کوئی بھی ہو، اگر مناسب سمجھے تو ان کی طلاق جاری کرسکتا ہے اس لیے کہ ان دونوں نے اسے یہ اختیار دے دیا ہے۔

4۔ مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ اگر کسی کو اس بارے میں کوئی اختیار ہے تو وہ ریاست ہے جو عدالت کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی شخص کو کسی عورت کو طلاق جاری کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر، کالج کا پرنسپل، یونیورسٹی کا وائس چانسلر، وزیراعظم کسی عورت کو طلاق جاری نہیں کرسکتا۔ یہی حال مولوی، مجتہد اور مرجع تقلید کا ہے۔ جس طرح سکول کا ہیڈ ماسٹر، کالج کا پرنسپل، یونیورسٹی کا وائس چانسلر، وزیراعظم کسی عورت کو طلاق نہیں دے سکتا، مرجع تقلید بھی کسی عورت کو طلاق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اگر کوئی عورت مذکورہ بالا افراد میں سے کسی کے پاس جائے، یا ان کے علاوہ کسی اور کے پاس جائے اور کہے کہ میرا شوہر میرے حقوق ادا نہیں کرتا اور مجھے طلاق بھی نہیں دیتا تو ان افراد میں سے کوئی بھی نہیں کہے گا کہ اگر شوہر طلاق نہیں دیتا تو میں طلاق جاری کردیتا ہوں۔ اگر وہ طلاق جاری کر بھی دے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ مجتہد اور مرجع کی بھی یہی حیثیت ہے اور ان کی دی ہوئی طلاق کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ جس طرح یہ مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ عدالت کی طلاق، سرے سے طلاق ہی نہیں ہوتی آپ مجتہد یا اس کے نمائندے کے ذریعے طلاق حاصل کریں، معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مولوی اور مجتہد کی دی

ہوئی طلاق سرے سے طلاق ہی نہیں ہوتی اور مرجع یا اس کے نمائندے کی دی ہوئی طلاق کے باوجود وہ عورت بدستور اسی شخص کی بیوی رہتی ہے، اس لیے کہ اسے طلاق دینے کا کوئی اختیار شوہر نے، ریاست نے، اللہ، رسول اور آئمہ نے نہیں دیا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مجتہدین و مراجع نائب امام ہیں لہٰذا زمانہ غیبت میں یہ اختیار انہیں حاصل ہے، یہ بالکل بے بنیاد، لغو اور فضول بات ہے۔ زمانہ غیبت کبریٰ میں کوئی نائب امام نہیں ہے۔ مجتہدین اور علماء کا دائرہ کار صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو دین کے احکام بتائیں اور ان کو دین کی تعلیم دیں۔ اس سے آگے ان کو کوئی اختیار اور ولایت حاصل نہیں ہے۔

احادیث اور حاکم شرع؟

جن احادیث سے شیعہ علما استدلال کرتے ہیں کہ حاکم شرع یعنی مجتہد جامع الشرائط شوہر کے ولی کی حیثیت سے عورت کو طلاق دے سکتا ہے ان احادیث سے دور دور تک یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ یہ روایات دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ اگر مرد عورت کے حقوق ادا نہ کرتے تو عورت اس سے خلع کا مطالبہ کرے گی اور اگر وہ نہ مانے تو عورت حاکم کی طرف رجوع کرے گی۔ دوسری صورت یہ کہ عورت کا شوہر کسی دور دراز سفر پر گیا ہوا اور لا پتا ہو جائے تو عورت حاکم کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔ پہلی قسم کی روایات کی مثال کے طور پر ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں:

عن ابی بصیر قال سمعت ابا جعفر یقول من کانت عندہ امراۃ فلم یکسھا ما یواری عورتھا
ویطعمھا ما یقیم صلبھا کان حقا علی الامام ان یفرق بینھما

ترجمہ: ابو بصیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس کے پاس کوئی بیوی ہو اور وہ اسے مناسب لباس مہیا نہ کرے جس سے وہ اپنا بدن ڈھانپ سکے اور مناسب خوراک نہ دے جس سے اس کی کمر قائم ہو سکے
تو امام پر فرض ہے کہ ان کو الگ کر دے۔ (فقیہ 3:441 حدیث 4529)

اس روایت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اگر مرد بیوی کے حقوق ادا نہ کرے اور بیوی امام کی طرف رجوع کرے تو اس پر لازم ہے کہ ان دونوں کو الگ کر دے۔ یعنی ان کا نکاح ختم کر دے۔ (اس روایت میں امام سے مراد حاکم ہے جیسا کہ بعد میں واضح ہو جائے گا۔)

یہ بات بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اگر مرد مالی لحاظ سے تنگ دست ہو لیکن اخلاقی لحاظ سے اچھا ہو، بیوی سے عزت، محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہو، بیوی کے ساتھ اس کا رویہ مثبت اور اچھا ہو تو بیوی تنگ دستی اور مالی مشکلات کو آسانی سے نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس اگر مالی لحاظ سے شوہر کی حالت صحیح ہو لیکن اس کا اخلاقی رویہ بہت برا ہو، مار پیٹ، تشدد اور بدسلوکی اس کا معمول ہو تو عسر و حرج اور ضرر والی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال صرف مالی تنگی والی صورتحال کی نسبت بہت بری اور نا قابل برداشت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جدائی صرف مالی تنگی والی صورت حال سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔

یہ روایت اس بات پر واضح ترین الفاظ میں دلالت کرتی ہے کہ اگر شوہر بیوی کے بنیادی حقوق ادا نہ کرے اور عورت اس کی شکایت حکومت سے کرے تو حکومت پر فرض ہے کہ ان دونوں کو جدا کر دے، یعنی ان کے رشتہ نکاح کو ختم کر دے۔ جدید ریاستی نظام میں حکومت یہ کام عدالت کے ذریعے کرتی ہے۔

دوسری قسم کی روایات میں سے ایک روایت یہ ہے:

عن ابی الصباح الکنانی عن ابی عبداللہ علیہ السلام فی امراۃ غاب عنھا زوجھا اربع سنین ولم ینفق
علیھا ولم یدر احی ھو ام میت، ایجبر ولیہ علی ان یطلقھا قال نعم ،وان لم یکن لہ ولی طلقھا السلطان

ترجمہ: ابی صباح کنانی سے روایت ہے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس عورت کے بارے میں پوچھا گیا جس کا شوہر چار سال سے غائب تھا اور یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے، آیا اس کے (یعنی گم شدہ شوہر کے) ولی کو اس بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ عورت کو طلاق دے دے؟ آپ نے

فرمایا: ہاں، اور اگر اس کا کوئی ولی نہ ہو تو سلطان اسے طلاق دے دے گا۔ (کافی جلد 6 صفحہ 146 باب المفقو د حدیث 3)

اس حدیث میں عورت کو طلاق دینے والی اتھارٹی کے لیے سلطان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ غور فرمائیں کہ سلطان ریاست کے حاکم کو کہا جاتا ہے یا مجتہد جامع الشرائط کو؟ دنیا کی کون سی ڈکشنری میں سلطان کے معنی مجتہد جامع الشرائط ہیں؟ اس حدیث میں مذکور لفظ سلطان سے مجتہد جامع الشرائط مراد لینا انتہائی درجے کی بے علمی ہے۔ تمام فقہائے امامیہ اس بات پر اتفاق بھی کر لیں کہ سلطان سے مراد مجتہد جامع الشرائط ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا سواد اعظم کے سب علماء اس بات پر اتفاق کر لیں کہ من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ میں مولا سے مراد دوست ہے۔ لیکن شیعہ علماء کا اس بات پر اتفاق بھی نہیں ہے جیسا کہ آگے چل کر آپ اس بارے میں آیت اللہ سید احمد خوانساری مرحوم کا بیان ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس روایت کا اگلا حصہ بڑا ہی عجیب ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام علیہ السلام سے کہا:

فان قال الولی انا انفق علیھا ؟ قال فلا یجبر علی طلاقھا ۔ قال قلت ارائیت ان قالت:

انا ارید مثل ما ترید النساء ولا اصبر ولا اقعد کما انا ؟ قال: لیس لھا ذالك ولا کرامۃ اذا انفق علیھا ۔

ترجمہ: اگر گم شدہ شوہر کا ولی کہے کہ میں اسے طلاق نہیں دیتا لیکن اس کا نفقہ دیتا ہوں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: پھر اسے طلاق دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا: اگر عورت یہ کہے کہ مجھے وہ چیز چاہیے جو عورتوں کو چاہیے ہوتی ہے اور میں صبر نہیں کر سکتی اور اس طرح نہیں بیٹھ سکتی۔ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: جب اسے نفقہ مل رہا ہے تو اسے ایسا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی اسے کوئی عزت و احترام حاصل ہے۔

روایت کے آخری حصے کا مطلب یہ ہے کہ اگر گم شدہ شوہر کا ولی، عورت کو نان و نفقہ فراہم کرنے پر آمادہ ہو تو عورت طلاق کا حق نہیں رکھتی اور اگر وہ اپنے فطری جذبات کی تسکین کی بات کرے تو یہ اس کا حق نہیں ہے اور نہ ہی اسے کوئی عزت و احترام حاصل ہے۔ اسی طرح اپنے جذبات دبا کر گلتی سڑتی رہے، نفسیاتی مریض بن جائے، چاہے ساری زندگی شوہر کا اتا پتا معلوم نہ ہو سکے۔ غور طلب بات ہے کہ آیا عورت شادی صرف نفقہ لینے کے لیے کرتی ہے؟ کیا اس کے ماں باپ نے اس کی شادی اس وجہ سے کی تھی کہ ان کے پاس اس کے لیے روٹی کپڑا اور مکان نہیں تھا؟ لہٰذا یہ کہنا کہ اگر گم شدہ شوہر کا ولی اسے نفقہ دیتا رہے تو وہ اپنی فطری ضرورت کی تسکین کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتی، ایک انتہائی غیر معقول بات ہے۔ ایسی بات کوئی بہت ہی جاہل شخص تو کر سکتا ہے مگر کوئی عاقل انسان ایسی بات کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کجا یہ کہ امام معصوم ایسی بات کہے۔ کیا روایت کا یہ حصہ فَإِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحُۢ بِإِحۡسَٰنٍ (معروف کے مطابق روکنا یا احسن انداز میں رخصت کر دینا) کے ساتھ کوئی جوڑ رکھتا ہے۔ روایت کے آخری حصہ کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ امام علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے بلکہ تحریف کرنے والوں کی دستکاری کا شاخسانہ ہے۔

بہر حال اس روایت سے استدلال کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اگر گمشدہ شوہر کا ولی بیوی کو طلاق بھی نہ دے اور نفقہ بھی نہ دے تو سلطان اس عورت کو طلاق دے دے گا۔ یعنی عورت سلطان سے طلاق لے سکتی ہے۔ سلطان کے آپ کچھ بھی معنی لے لیں اس کے معنی مجتہد جامع الشرائط ہرگز نہیں ہیں۔ اس مضمون کی بعض دوسری روایات میں سلطان کی جگہ والی یا حاکم کا لفظ آیا ہے، ان سے بھی مجتہد جامع الشرائط مراد لینا جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جدید سیاسی تصورات کی رو سے سلطان سے مراد ریاست ہے جو اپنے اختیارات مختلف اداروں کے ذریعے استعمال کرتی ہے۔ موجودہ دور میں اس سے حکومت کی قائم کردہ عدالت ہی مراد ہو سکتی ہے۔

کچھ روایات میں یہ مسئلہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ امام علیہ السلام سے ایسی عورت کے بارے میں پوچھا گیا جس کا شوہر لا پتا ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ عورت اس بات پر صبر اور خاموشی سے کام لے رہی ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ لیکن اگر وہ والی کی طرف رجوع کرے تو والی اسے چار سال کی مہلت دے گا اور جس علاقے میں شوہر کی گمشدگی کا امکان ہو وہاں خط لکھ کر یا کسی کو بھیج کر اس کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر چار سال کے دوران اس کی موت یا زندگی کی خبر نہ ملے تو اس لا پتا شوہر کے ولی کو بلا کر اس سے پوچھے گا کہ اس لا پتا شوہر کا کوئی مال موجود ہے؟ اگر اس

کا مال موجود ہو تو والی اسے حکم دے گا کہ جب تک اس کی موت یا زندگی کی تصدیق نہیں ہو جاتی اس کا نفقہ ادا کرتا رہے اور اگر وہ اس کا نفقہ ادا کرنے سے انکار کرے تو اسے طلاق دینے پر مجبور کرے گا۔ اور اگر وہ طلاق نہ دے تو والی خود طلاق دے دے گا۔

ان روایات میں چار سال کی مہلت اس دور کی سفر کی سہولیات اور معلومات کی ترسیل کے ذرائع کے لحاظ سے مقرر کی گئی۔ دور حاضر میں سفر اور معلومات کی ترسیل کا کام بہت تیز رفتار ہو گیا ہے۔ جو بات اس دور میں کئی دنوں یا ہفتوں کے سفر کے بعد ایک شہر سے دوسرے پہنچتی تھی اب وہ چند سیکنڈ میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔

لاپتا شوہر کی بیوی کے مسئلہ میں جتنی بھی روایات ہیں ان کا لب ولہجہ اور ان میں بتایا گیا راہ حل یہی ہے۔ سب سے پہلے یہ بات قابل غور ہے کہ اس کیس میں یہ بات کہاں سے ثابت ہوتی ہے کہ امام علیہ السلام کسی شیعہ عورت کے مسئلہ کا حل بتا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کیس شیعہ specifc نہیں ہے۔ ایک عمومی مسئلہ ہے جو شیعہ اور سنی کسی بھی عورت کو پیش آ سکتا ہے اور امام علیہ السلام اس کا حل بتا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کو شیعہ عورت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ نام نہاد شیعہ حاکم شرع ایک طاقت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ امام علیہ السلام سے آنے والے زمانے کے بارے میں نہیں بلکہ خود ان کے اپنے زمانے میں لاپتا ہو جانے والے شخص کی بیوی کا مسئلہ پوچھا جا رہا ہے۔ اگر حکومت کے متوازی '' حاکم شرع'' والا تصور درست مان لیا جائے تو امام علیہ السلام کی موجودگی میں بنیادی طور پر حاکم شرع خود امام علیہ السلام ہوں گے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آئمہ کے دور میں کس امام کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ وہ کسی شیعہ عورت کے لاپتا شیعہ شوہر کے مسئلہ کے بارے میں اس طرح کی تحقیقات کرواتے، پھر اس کے ولی کو بلاتے، اسے نفقہ ادا کرنے کا حکم دیتے اور اگر وہ انکار کرتا تو امام علیہ السلام اس عورت کو طلاق دے دیتے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام نے ہمیشہ نظر بندی اور قید و بند کی صعوبتوں میں زندگی بسر کی اور ان کے شیعہ ان سے آزادانہ میل جول بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ آئمہ معصومین علیہم السلام کے زمانہ حیات میں صرف چند سال ایسے تھے جن میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کو اظہار خیال کی کچھ آزادی میسر آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنو امیہ کا اقتدار کمزور ہو کر ان کے ہاتھ سے نکل رہا تھا اور بنی عباس اقتدار اہاتھ میں لینے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ پھر جب اقتدار بنی عباس کے ہاتھ میں آ گیا تو انہوں نے بنی امیہ سے بھی زیادہ ظلم وستم کے ساتھ آئمہ پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اولاد علی و فاطمہ سلام اللہ علیہا پر زمین اس قدر تنگ کر دی گئی تھی کہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو دور دراز کے علاقوں میں جا کر معمولی محنت مزدوری کر کے وقت گزارتے تھے اور اپنی شناخت بھی ظاہر نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ انہیں یقین ہوتا تھا کہ اگر ان کی اصل شناخت ظاہر ہو گئی تو انہیں قتل کر دیا جائے گا یا زندہ دیوار میں چنوا دیا جائے گا۔ بغداد کی دیواروں میں سادات کا چنا جانا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لبنانی عالم محمد جواد مغنیہ نے اپنی کتاب شیعہ والحاکمون میں اولاد علی و فاطمہ سلام اللہ علیہا پر ظلم وستم کے ایسے ایسے واقعات تحریر کیے ہیں جن کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ '' شیعہ اور جابر حکمران'' کے نام سے دستیاب ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام چودہ سال بغداد کے زندان میں قید رہے اور زندان میں ہی شہادت پائی۔ مامون ملعون بہت شاطر تھا، اس نے سیاسی انداز اختیار کیا اور امام رضا علیہ السلام کو اپنا داماد اور ولی عہد بنا کر اپنے محل میں محدود کر دیا اور آخر کار زہر ستم سے شہید کر دیا۔ اس کے بعد امام محمد تقی، امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام بھی ہمیشہ نظر بندی اور پہروں میں محدود رہے اور آخر کار زہر ستم سے شہید کر دیئے گئے۔ امام زمانہ کی ولادت کو خفیہ رکھا گیا تا کہ حکمران انہیں نقصان نہ پہنچا دیں، حکمرانوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ستر سال وہ غیبت صغریٰ میں رہے اور پھر ان کی غیبت کبریٰ واقع ہو گئی۔

جبر و تشدد کے اس ماحول میں جب سادات کو شدید بے رحمی کے ساتھ قتل کیا جا رہا تھا اور انہیں زندہ دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا، جب آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم نظر بندیوں اور شدید پابندیوں میں تھے، کیا ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ ریاست کے اندر ایک متوازی حکومت کا نظام قائم کرتے؟ کسی

شیعہ عورت کا شوہر لا پتا ہو جاتا تو اس کے شوہر کا پتا لگانے کے لیے اس علاقے میں اپنے نمائندے کو خط لکھتے، کوئی تفتیشی افسر بھیج کر تفتیش کرواتے، اس کے ولی کو بلا کر اسے کہتے کہ اس کی بیوی کو نفقہ ادا کرو یا طلاق دو، اور وہ یہ دونوں کام نہ کرتا تو امام علیہ السلام ''حاکم شرع'' کی حیثیت سے طلاق دے دیتے۔ کیا ایک بھی ایسی مثال موجود ہے کہ ایسا کوئی کیس کسی امام علیہ السلام کے سامنے آیا اور آپ نے یہ سارا طریقہ کار اختیار کر کے آخر پر ''حاکم شرع'' کی حیثیت سے اس عورت کو طلاق دے دی ہو؟

ان معروضات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی طلاق کے بارے میں ان روایات میں جس حاکم، والی، سلطان یا امام کا ذکر ہوا ہے وہ ریاست کا حاکم ہے نہ کہ جامع الشرائط مجتہد۔ آیت اللہ سید احمد خوانساریؒ نے اپنی کتاب جامع المدارک میں ان روایات کا ذکر کرنے کے بعد واضح طور پر فرمایا ہے:

ثم ان ههنا اشكال آخر وهو ان التعبير فى لسان الاخبار المذكورة بالامام فى بعضها او الوالى فى بعضها و سلطان فى بعضها و انطباق السلطان او الوالى على الفقهاء فى عصر الغيبة محل اشكال

ترجمہ: اور پھر یہاں ایک اور پیچیدگی پیش آتی ہے کہ ان احادیث میں سے بعض میں لفظ امام، بعض میں لفظ والی اور بعض میں لفظ سلطان استعمال ہوا ہے اور سلطان اور والی کے الفاظ کا زمانہ غیبت کے فقہاء پر انطباق ایک ایسی بات ہے جس کے سامنے سوالیہ نشان ہے۔

(جامع المدارک جلد 4 صفحہ 567)

یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہے کہ احادیث معصومین میں امام کا لفظ چار معنوں میں استعمال ہوا ہے: (1) امام معصوم (2) امام جماعت (3) قاضی (4) حاکم وقت۔ اگر ان سب کی مثالیں یہاں بیان کی جائیں تو مضمون غیر ضروری طویل ہو جائے گا اور ہم اپنے اصل موضوع سے دور ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود دو روایات ملاحظہ فرمائیں۔ یہ دونوں روایات امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہیں:

لو ان الناس تركوا الحج لكان على الوالى ان يجبرهم علىٰ ذالك و على المقام عنده

ولو تركوا زيارة النبى لكان على الوالى ان يجبرهم علىٰ ذالك و على المقام عنده

وان لم يكن لهم اموال انفق عليهم من بيت مال المسلمين

ترجمہ: اگر لوگ حج کو ترک کر دیں تو والی پر فرض ہے کہ وہ انہیں اس پر مجبور کرے اور انہیں اس کے قریب رہنے پر مجبور کرے اور اگر لوگ زیارت نبی کو ترک کر دیں تو والی پر فرض ہے کہ وہ انہیں اس پر مجبور کرے اور اس کے قریب رہنے پر مجبور کرے اور اگر ان کے پاس مالی وسائل نہ ہوں تو مسلمانوں کے بیت المال سے ان کے اخراجات ادا کرے۔ (کافی جلد 4، باب الاجبار علی الحج حدیث 1)

لو عطل الناس الحج لوجب على الامام ان يجبرهم على الحج

ترجمہ: اگر لوگ حج چھوڑ دیں تو امام پر واجب ہے کہ وہ انہیں حج پر مجبور کرے۔ (ایضاً حدیث 2)

ان میں سے پہلی روایت میں والی اور دوسری روایت میں امام کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان روایات میں والی اور امام سے مراد حاکم وقت ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر لوگ حج بیت اللہ اور زیارت رسول اللہ کو ترک کر دیں تو کون انہیں جبری طور پر حج یا زیارت رسول پر بھیج سکتا ہے؟ اگر لوگوں کے پاس مالی وسائل نہ ہوں تو کون اس کام کے لیے انہیں بیت المال سے مالی وسائل فراہم کر سکتا ہے؟ امام معصوم؟ مجتہد جامع الشرائط؟ یا حاکم وقت؟ ظاہر سی بات ہے حاکم۔ اس لیے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام تو خود ہمیشہ جبر و تشدد، اسارت اور نظر بندی کی مجبوریوں میں تھے، وہ لوگوں کو حج یا زیارت نبی کے لیے یا کسی اور اجتماعی واجب کے لیے کیسے مجبور کر سکتے تھے اور بیت المال سے ان کے اخراجات کیسے ادا کر سکتے تھے؟ بیت المال کا لفظ بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں امام اور والی سے مراد حکمران ہے اس لیے کہ بیت المال حکمرانوں کے اختیار میں ہوتا ہے۔ بیت المال کبھی بھی امام معصوم کے

اختیار میں نہیں تھا سوائے اس دور کے جب امیر المومنین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام برسر اقتدار تھے اور وہ بھی اس لیے ان کے اختیار میں تھا کہ وہ ظاہری طور پر حکمران تھے۔

مجتہد جامع الشرائط کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کو کسی واجب کفائی کے لیے مجبور کر سکیں۔ حالیہ چند دہائیوں میں کچھ شیعہ مولویوں کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر یہ غلط فہمی نہیں ہو جانی چاہیے کہ شیعہ علما و فقہا ہمیشہ اس قسم کی شاہانہ زندگی گزارتے تھے۔ شہید اول، شہید ثانی اور شہید ثالث کی شہادتیں، پھر صدام کے دور حکومت میں شیعہ علماء وفقہاء کی مظلومیت اور بے بسی کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔ صدام نے عزاداری امام حسین علیہ السلام پر پابندی لگائی اور کوئی شیعہ جامع الشرائط مجتہد لوگوں کو عزاداری کے لیے گھروں سے نہیں نکال سکا۔ پھر انقلاب ایران کے بعد ایران میں حکومت سے اختلاف رائے رکھنے والے مجتہدین و مراجع پر جو ظلم و ستم روا رکھا گیا اس نے تو تاریخ کے سب ظالموں کو مات دے دی۔ آئمہ معصومین کی طرح شیعہ فقہاء بھی تاریخ کے ہر دور میں مظلوم ہی رہے۔

ان روایات میں غور وفکر کرنے سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں جس سلطان، حاکم، والی اور امام کا ذکر ہے اس سے مراد حاکم ہے۔ حاکم کے ساتھ خود سے ''شرع'' کا لفظ لگا کر ''حاکم شرع'' بنا لینا اور اس سے مجتہد مراد لینا صرف غلط اور بے بنیاد بات ہی نہیں ہے بلکہ بددیانتی اور خیانت بھی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان روایات میں امام، سلطان، حاکم یا والی کے الفاظ سے جامع الشرائط مجتہد کے اختیار طلاق پر استدلال کرنا بالکل بے معنی اور لغو بات ہے، ایسی ہی لغو بات جیسے حدیث غدیر میں مولا سے دوست مراد لینا یا شاید اس سے بھی زیادہ لغو۔ مجتہد کو نائب امام قرار دے کر امام علیہ السلام کے حکومتی اختیارات اسے دینا ایک ایسی بات ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ زمانہ غیبت کبریٰ میں نہ کوئی نائب امام ہے اور نہ ہی کسی کے پاس امام علیہ السلام کے حکومتی اختیارات ہیں۔

(نائب امام کے حوالے سے ہمارا ایک مقالہ: ''نائب امام کون؟'' ہماری ویب سائیٹ پر موجود ہے، تفصیل جاننے کے خواہش منداحباب وہاں رجوع فرمائیں۔ کچھ علماء اپنی ولایت ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث کا سہارا لیتے ہیں جسے مقبولہ عمر بن حنظلہ کہا جاتا ہے۔ اس کا جائزہ بھی ہم نے اپنی کتاب: ''ولایت فقیہ: افسانہ وحقیقت'' میں لیا ہے جو ویب سائیٹ پر موجود ہے۔)

خلاصہ کلام یہ کہ مجتہد صرف ان تین صورتوں میں طلاق دے سکتا ہے:

1۔ شوہر نے اسے طلاق کی وکالت دی ہو۔ 2۔ مرد اور عورت دونوں اسے ثالث بنائیں اور طلاق کا اختیار بھی دے دیں۔

3۔ ریاست نے اسے جج کے عہدے پر مقرر کیا ہو اور وہ ریاست کے دیئے ہوئے اختیار کو استعمال کر کے کسی عورت کی درخواست پر اسے خلع دے۔

ان تین صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں مجتہد کسی عورت کو طلاق نہیں دے سکتا۔ اگر کسی عورت کا شوہر اس کے حقوق نہ دیتا ہو، یعنی معروف کے مطابق اسے نہ رکھ رہا ہو اور خوش اسلوبی سے اسے فارغ بھی نہ کرے اور وہ عورت سیدھی سیدھی کسی نام نہاد ''حاکم شرع'' یعنی مرجع تقلید کے پاس چلی جائے اور وہ اسے طلاق دے دے تو اس کی دی ہوئی طلاق سرے سے ہوتی ہی نہیں اور وہ عورت بدستور اسی مرد کی بیوی رہتی ہے۔

اس کے برعکس ایسی عورت دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنی عسر وحرج یا ضرر والی صورت حال کو واضح کر کے خود نکاح کے اس معاہدے کے خاتمے کا اعلان کر سکتی ہے اس لیے کہ شریعت کسی شخص کو ایسے معاہدے میں بندھے رہنے پر مجبور نہیں کرتی جس کی دوسرا فریق خلاف ورزی کر رہا ہو۔ ایسا کرنے کی بجائے اگر وہ عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر لے تو والی، حاکم اور سلطان سے طلاق لینے والی احادیث کے مطابق یہ طلاق بالکل درست ہے اور اس کے بعد کسی نام نہاد ''حاکم شرع'' یا اس کے نمائندے سے صیغے پڑھوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اسلام میں مولوی نام کا کوئی ادارہ یا حکومت کے متوازی نام نہاد ''حاکم شرع'' کا کوئی ادارہ سرے سے ہے ہی نہیں۔

نکاح نامہ کا کالم نمبر 18: یہاں پر ایک اہم بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ حکومتی عدالت اور خود ساختہ حاکم شرع والی مشکلات سے بچنے کا ایک

آسان راستہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت نکاح نامہ کے کالم نمبر 18 کو بہت احتیاط اور سمجھداری کے ساتھ پر کرلیا جائے اور یہ بات واضح طور پر لکھ دی جائے کہ اگر شوہر بیوی کے واجب یا جائز حقوق ادا نہ کرے اور عورت کی زندگی مشکلات سے دوچار ہوجائے اور اس کے لیے عسر وحرج اور ضرر والی صورت حال پیدا ہوجائے تو عورت کے مطالبہ پر وہ اسے خلع دینے کا پابند ہوگا۔ اگر وہ خلع دینے سے انکار کرے گا تو عورت شوہر کی طرف سے خلع کی وکیل ہوگی اور شوہر کی وکیل کی حیثیت سے شوہر کی طرف سے اپنے آپ کو خلع دے کر اس کی زوجیت سے آزاد ہوجائے گی۔ اگر نکاح نامہ میں یہ کالم اس طرح سے پر کرلیا جائے پھر اس کے بعد شوہر بیوی کے حقوق ادا نہ کرے، اس کی زندگی کو مشکلات سے دوچار کردے، اس کے لیے عسر وحرج اور ضرر والی صورت حال پیدا کردے تو عورت، حیض سے پاکیزگی کی حالت میں، ایسے طہر میں جس میں مباشرت نہ کی ہو، دو عادل گواہوں کی موجودگی میں اپنی اس صورت حال کو واضح کر کے اس طرح اپنے آپ کو خلع دے سکتی ہے: ''میں فلاں بنت فلاں زوجہ فلاں ابن فلاں نے، نکاح نامہ کے کالم 18 میں طے شدہ شرط کے مطابق اپنے شوہر کے وکیل کے طور پر اپنے آپ کو خلع دے دی۔''

کالم 18 کے حوالے سے ایک اہم تجویز:

ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے معاملات میں عام طور پر لڑکے والوں کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور لڑکی والے ذرا کم تر پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثر لڑکی والے نکاح نامہ میں کسی قسم کی شرائط لکھنے سے ہچکچاتے ہیں کہ کل کو ان کی بیٹی کے لیے مشکلات پیدا نہ ہوجائیں۔ اس کے علاوہ شادی کے موقع پر طلاق کے ذکر کو بدشگونی بھی سمجھا جاتا ہے اس لیے طلاق سے متعلق کوئی بات کرنا یا نکاح نامہ میں اس کے بارے میں کوئی شرط عائد کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر نکاح نامہ کا کالم نمبر 18 پر ہی نہیں کیا جاتا۔ ہم حکومت سے استدعا کرتے ہیں کہ حکومت خود نکاح نامہ میں اس بات کو درج کردے کہ اگر شوہر بیوی کے واجب یا جائز حقوق ادا نہ کرے اور عورت کی زندگی مشکلات سے دوچار ہوجائے اور اس کے لیے عسر وحرج اور ضرر والی صورت حال پیدا ہوجائے تو عورت کے مطالبہ پر وہ اسے خلع دینے کا پابند ہوگا۔ اگر وہ خلع دینے سے انکار کرے گا تو عورت شوہر کی طرف سے خلع کی وکیل ہوگی اور شوہر کے وکیل کی حیثیت سے شوہر کی طرف سے اپنے آپ کو خلع دے کر اس کی زوجیت سے آزاد ہوجائے گی۔

چند سوالات اور ان کے جوابات:

سوال: اگر عدالت کے بار بار بلانے پر شوہر عدالت میں حاضر ہوکر اپنا موقف بیان نہ کرے اور عدالت یک طرفہ طور پر عورت کے حق میں فیصلہ دے دے تو کیا یہ فیصلہ درست ہوگا؟

جواب: جس طرح دیگر معاملات میں کوئی فریق عدالت کے بار بار بلانے پر حاضر نہ ہو تو عدالت اس کی عدم موجودگی میں دوسرے فریق کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے، طلاق میں بھی یہ اصول نافذ ہوگا۔ عدالت کے بار بار بلانے کے باوجود شوہر کا عدالت میں حاضر نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مسئلہ کو حل نہیں کرنا چاہتا۔ شوہر کے اس رویے سے عورت کا موقف صحیح ثابت ہوجاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جو مولوی صاحبان نام نہاد حاکم شرع بن کر خواتین کو طلاق دیتے ہیں وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ تین بار مرد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرد سے رابطہ نہ ہو تو حاکم شرع کے طور پر صیغہ طلاق جاری کردیتے ہیں۔ میرے نوٹس میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ نام نہاد حاکم شرع نے لڑکی والوں سے پیسے لے کر خانہ پری کے لیے تین بار مرد سے رابطہ کرنے کی ڈھیلی ڈھالی کوشش کی اور اس کے بعد خاتون کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے صیغہ طلاق جاری کردیا اور سرٹیفکیٹ بھی دے دیا کہ شرعی طلاق ہوگئی۔ نام نہاد حاکمان شرع کی نام نہاد پرائیویٹ شرعی عدالتوں میں بھی کرپشن کی عملداری قائم ہوچکی ہے۔

سوال: بعض اوقات خواتین عدالت کو شوہر کا غلط ایڈریس دے دیتی ہیں جس پر عدالتی نوٹس اسے موصول ہی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں عدالت کے ذریعے لی گئی خلع کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: سب سے بنیادی بات جسے ہر مسلمان کو ہر حال میں اور سب معاملات میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ دنیا کی سب عدالتوں کے بعد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت بھی لگنی ہے جس میں ہمیں اپنے چھوٹے بڑے سب اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ہم ہر روز نماز میں کئی بار مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھتے ہیں۔جس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کا دن جو کہ عدل کا دن ہوگا اس دن کا مالک ومختار اور حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔نماز میں ہر روز کئی بار یہ جملہ پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں یہ بات یادرہے کہ اگر ہم اس دنیا میں ظلم کریں،جعلی دستاویزات اور ثبوت فراہم کر کے عدالتوں کو دھوکا دے کر، یا دوسرے فریق کو دھوکا دے کر اپنے حق میں فیصلہ لے بھی لیں تو اللہ کی عدالت سے نہیں بچ سکیں گے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار اصحاب سے فرمایا:

انما اقضی بینکم بالبینات والایمان و بعضکم الحن بحجته من بعض
فایما رجل قطعت له من مال اخیه شیئا فانما قطعت له به قطعة من النار

ترجمہ: میں تمہارے درمیان تمہارے پیش کردہ ثبوتوں اور قسموں کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہوں اور تم میں سے بعض لوگ دوسروں کی نسبت اپنی دلیل کو زیادہ اچھے انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔پس اگر میں کسی شخص کو اس بھائی کے مال سے کوئی ٹکڑا دے دوں تو وہ سمجھ لے کہ میں نے اسے جہنم کی آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔ (کافی 414:7)

اس حدیث میں یہ بات واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص حق بجانب نہ ہو اور صرف اپنی چرب زبانی سے، یا اپنے وکیل کی ذہانت، قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر عدالت کو اپنے حق میں قائل کر لے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ کر دے تو جو کچھ وہ لے گا وہ اس کے لیے جہنم کی آگ کے ٹکڑے کی حیثیت رکھتا ہے، چاہے فیصلہ کرنے والا قاضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کیوں نہ ہوں۔

بنابریں شوہر سے خلع لینے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کرتے وقت خواتین کو اللہ کی عدالت میں حاضری کو ضرور یاد رکھنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اس دنیا میں شوہر کی بنائی ہوئی چھوٹی سی جہنم برداشت نہیں ہو رہی اور اس سے نجات کے لیے وہ عدالت میں آ گئی ہیں تو قیامت کے دن اللہ کی جہنم کا عذاب کیسے برداشت کریں گی،اس جہنم سے نجات کے لیے کس عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گی جبکہ اس جہنم کی سزا اس حاکم کی سنائی ہوئی ہوگی جو مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ہم سب کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اگر کسی وجہ سے اس دنیا میں ہمیں ہمارا حق نہ ملے تو قیامت کے دن مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی عدالت میں ہمارے حق میں بہت اچھا فیصلہ ہو جائے گا جس کا فائدہ ہمیں آخرت کی ابدی اور لازوال زندگی میں ہوگا۔اس کے برعکس اگر ہم غلط بیانی کر کے،جعلی ثبوت اور جھوٹے گواہ پیش کر کے عدالت کو گمراہ کر کے اپنے حق میں فیصلہ لے لیں تو درحقیقت آخرت کی زندگی میں اپنے لیے جہنم خرید رہے ہیں۔سب وکلاء پر لازم ہے اور جج صاحبان پر بھی لازم ہے کہ ہر مقدمہ کی کارروائی کے آغاز میں یہ فرمان نبوی مقدمے کے دونوں فریقوں کو سنا دیا کریں۔

اب آتے ہیں سوال کے جواب کی طرف۔اگر عورت شوہر کا غلط ایڈریس بتاتی ہے جس پر شوہر کو عدالتی نوٹس موصول نہیں ہوتے تو نکاح نامہ پر دیئے ہوئے شوہر کے شناختی کارڈ نمبر کے ذریعے نادرا کے ریکارڈ سے اس کا صحیح ایڈریس اور موبائل فون معلوم کیا جا سکتا ہے اور اس کے موبائل پر بھی عدالت کی طرف سے نوٹس بھیجا جا سکتا ہے۔اسی طرح دوسرے ذرائع استعمال کر کے شوہر کا پتا لگایا جا سکتا ہے، یہ کوئی بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔اگر ان سب طریقوں کے باوجود عدالت شوہر سے رابطہ نہ کر سکے اور اس کی عدم موجودگی میں عورت کے حق میں فیصلہ دے دے تو یہ فیصلہ تو صحیح ہوگا،طلاق بھی ہو جائے گی لیکن عدالت کو غلط معلومات فراہم کرنے کی وجہ سے عورت گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوگی۔جو وکیل صاحبان ایسی خواتین کو یا دیگر موکلین کو ایسے مشورے دیتے ہیں جن سے عدالت کو گمراہ کر کے اپنے حق میں فیصلہ لیا جا سکتا ہو، وہ وکیل صاحبان بھی قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

سوال: ایسی طلاق بائن ہوگی؟

جواب: عدالت کی طرف سے دی گئی یہ طلاق خلع طلاق بائن ہوگی۔ مرد کو اس میں رجوع کا حق نہیں ہوگا۔

سوال: مہر کی صورت کیا ہوگی؟

جواب: اگر مرد عورت کے مطالبہ پر خلع دے تو اس صورت میں عورت کو پورا مہر یا اس کا کچھ حصہ بطور فدیہ ادا کرنا ہوگا جو مرد اور عورت باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں لیکن مرد مہر سے زیادہ فدیہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ عورت مہر کے عوض اس کی زوجیت میں آئی تھی اور زوجیت سے نکلنے کے لیے زیادہ سے زیادہ پورا مہر ہی واپس کرنا ہوگا۔ اگر مرد مہر سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور عورت اپنی جان چھڑانے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہو تو مہر سے زائد جو کچھ بھی مرد لے گا وہ اس کے لیے حرام ہوگا۔ لیکن اگر مرد طلاق نہ دے بلکہ اس جھگڑے کا فیصلہ کوئی تیسرا فریق کرے، چاہے عدالت ہو یا معاشرے یا خاندان کی پنچایت یا خاندان اور برادری کا کوئی بڑا، تو وہ صورتحال کی مناسبت سے اس بارے میں کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے لیکن مہر سے زیادہ لینا مرد کے لیے حرام ہے۔ اس سلسلہ میں ریاستی قانون کی بھی یہی حیثیت ہے۔ مہر سے زائد لینے کی ایک ہی صورت بن سکتی ہے کہ مرد نے مہر کے علاوہ کوئی چیز عورت کو دی ہو تو اس کو واپس لینے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ جو چیز اس نے عورت کو نہیں دی اس کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

البتہ یہاں اس اخلاقی نکتے کو بیان کرنا ضروری ہے کہ ایسے موقع پر مرد کو، جو ویسے تو خود کو مجازی خدا کے عہدے پر فائز سمجھتا ہے، کسی قسم کی کمینگی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے وسیع القلبی، مردانہ شرافت اور کریمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ میں ایک ایسے نیک اور صالح مومن کو جانتا ہوں جس کی منکوحہ نے رخصتی سے پہلے ہی اس سے خلع کا مطالبہ کر دیا۔ اس شریف انسان نے اسے خلع دے دی اور پورا مہر بھی ادا کر دیا۔

سوال: اگر فیملی کورٹ کی جج غیر شیعہ خاتون ہو تو اس کے فیصلہ کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: جج کے مرد یا عورت ہونے یا شیعہ اور غیر شیعہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب امیر المومنین علیہ السلام خلیفہ بنے تھے تو کیا انہوں نے ہر شہر، ہر قصبے اور ہر قریہ میں سنی ججز کو معزول کر کے شیعہ جج لگا دیئے تھے؟ یا کسی بھی مقام پر کسی سنی جج کو اس لیے برطرف کیا کہ وہ سنی تھا اور اس کی جگہ کسی شیعہ کو اس لیے جج لگایا کہ وہ شیعہ تھا؟ مولا علی بیعت کرنے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی تھی جو پہلے تین خلفاء کی بیعت کر چکے تھے اور مولا علی کی بیعت انہوں نے پہلے امام کے طور پر نہیں بلکہ چوتھے خلیفہ کے طور پر کی تھی۔ جنگ جمل و صفین و نہروان میں امیر المومنین علیہ السلام کی فوج کے افسروں اور سپاہیوں کی غالب اکثریت ان لوگوں کی تھی جو آپ کو چوتھا خلیفہ مانتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دور خلافت میں کوئی تقرری اور برطرفی شیعہ اور غیر شیعہ کی بنیاد پر نہیں کی، بلکہ آپ کے دور کی سب تقرریاں میرٹ کی بنیاد پر تھیں۔

سوال: عدالت سے طلاق کے وقت عورت کا حالت طہر میں ہونا ضروری ہے؟

جواب: اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ طلاق کی یہ شرائط کہ طلاق کے وقت عورت حیض سے پاک ہو، طلاق دو عادل گواہوں کی موجودگی میں ایسے طہر میں دی جائے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو، ان شرائط کی پابندی اس صورت میں واجب ہے جب شوہر خود یا اس کا وکیل بیوی کو طلاق دے، چاہے خود طلاق رجعی دے چاہے عورت کے مطالبہ پر طلاق خلع دے۔ لیکن جب شوہر طلاق نہ دے رہا ہو اور عورت کو طلاق لینے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑے تو اس صورت میں ان شرائط کا ہونا ظاہراً ضروری نہیں ہے۔ لیکن احتیاط یہ ہے ان شرائط کو پورا کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی جائے اور ایسا کرنا بالکل مشکل نہیں ہے۔ اگر عورت کا وکیل عدالت سے درخواست کرے کہ اس کی خلع کا فیصلہ اس دن سنایا جائے جب وہ طہر کی حالت میں ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ عدالت اس درخواست کو قبول نہ کرے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ طلاق کے وقت عورت اس طہر میں ہو جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو تو جب وہ خلع لینے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کرتی ہے تو اس سے بہت پہلے ہی اس کے اور شوہر کے درمیان اتنی دوری آ چکی ہوتی ہے کہ انہیں مباشرت کیے کافی عرصہ گزر چکا ہوتا ہے۔

پھر جس دن وہ عدالت میں درخواست دائر کرتی ہے اس دن سے لے کر فیصلے کے دن تک کم از کم دو تین ماہ کا عرصہ لگ ہی جاتا ہے اور اس دوران بھی مباشرت کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ایسا تو ممکن نہیں ہے کہ عدالت میں خلع کا کیس بھی چل رہا ہو اور ساتھ ساتھ مباشرت بھی چل رہی ہو۔لہٰذا عدالت کی طرف سے خلع کے فیصلے کے وقت عورت کے اس طہر میں ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا جس میں انہوں نے مباشرت کی ہو۔

گواھوں کی موجودگی: بنیادی طور پر طلاق پر گواہی اس لیے ہوتی ہے تا کہ کل کو مرد اور عورت میں سے کوئی اس طلاق کا انکار نہ کر سکے۔ گواہوں کا عادل ہونا بھی اس لیے ضروری ہے کہ کسی لالچ ، دباؤ یا خوف کی وجہ سے وہ اپنی گواہی سے منحرف نہ ہو جائیں ۔ دو عادل گواہوں کی موجودگی میں طلاق کا مقصد صرف یہ ہے کہ طلاق کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا سد باب ہو سکے۔لیکن جب مرد خلع دینے پر تیار نہ ہو اور عورت عدالت کے ذریعے خلع لے لے تو چونکہ خلع واقع ہی عدالت کے ذریعے ہوتی ہے اور عدالت کا فیصلہ تحریری صورت میں موجود ہوتا ہے اور عدالت میں اس کا ریکارڈ بھی موجود ہوتا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں شک وشبہ کے پیدا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ۔لہٰذا عدالت کی طرف سے دی جانے والی خلع پر گواہی کی ضرورت نہیں رہتی ۔

لیکن جب عدالت فیصلہ سناتی ہے تو اس وقت دونوں فریقوں کے وکیل عدالت میں موجود ہوتے ہیں ۔ان دونوں وکیلوں کی موجودگی کو دو گواہوں کی موجودگی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر مرد کا وکیل موجود نہ ہو تو عورت کا وکیل تو موجود ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی عدالتی اہل کار یا عورت کا کوئی مرد رشتہ دار بھی موقع پر موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی موجودگی دو گواہوں کی موجودگی والی شرط کو پورا کر دیتی ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ گواہوں کا عادل ہونا ضروری ہے تو اس کے بارے میں دو باتیں کہی جاسکتی ہیں:

ایک یہ کہ ہماری فقہی کتب میں کسی انسان کے عادل ہونے کا جو معیار بیان کیا گیا ہے اگر اس معیار کا عادل تلاش کرنے نکلیں تو شاید ہی کوئی عادل ملے ۔ بڑے بڑے علماء میں سے بھی چند ایک ہی بمشکل عدالت کے اس معیار پر پورے اترتے نظر آئیں گے۔لیکن اگر عادل انسان سے مراد اچھے چال چلن والا اور اچھی شہرت والا شریف انسان ہو تو فریقین کے وکلاء کی موجودگی کو گواہوں کی موجودگی قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن اگر یہ بات کسی کے لیے قابل قبول نہ ہو یا دل مطمئن نہ ہو رہا ہو تو پھر یہ کیا جاسکتا ہے کہ خاتون اور اس کے خاندان والے، فیصلے کے دن دو عادل گواہوں کو اپنے ساتھ عدالت لے جائیں ۔جج صاحب یا صاحبہ سے درخواست کی جائے کہ تحریری فیصلہ کے بعد گواہوں کے سامنے یہ جملہ بھی کہہ دیں کہ میں نے اس خاتون کو طلاقِ خلع دے دی۔اس طرح گواہوں کی موجودگی والی شرط بھی پوری کی جاسکتی ہے۔لیکن ایسا کرنا ضروری نہیں ہے۔

اس طرح ان اقدامات کے ذریعے عدالتی طلاق میں وہ ساری شرائط بہ آسانی پوری کی جاسکتی ہیں جن کو بنیاد بنا کر نام نہاد خود ساختہ حاکم شرع کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی ۔ چونکہ تھوڑی سے کوشش اور منصوبہ بندی سے یہ سب شرائط پوری ہوسکتی ہیں لہٰذا اس کے لیے کسی قانون سازی کی بھی ضرورت نہیں ہوگی ۔ جو مولوی صاحبان اس مسئلہ پر قانون سازی کی باتیں یا کوششیں کر رہے ہیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ہر ضلع یا تحصیل کی سطح پر حکومت کچھ مولوی صاحبان کو مقرر کر دے جو عدالت کی طرف سے طلاق ہو جانے کے بعد صیغے پڑھ دیا کریں اور اس طرح مولوی صاحبان کے روزگار کی ایک صورت نکل آئے ۔ اگر حکومت ایسا کوئی اقدام کرتی بھی ہے تو خود انہی مولوی صاحبان کی منطق کے مطابق وہ درست نہیں ہوگا۔اس لیے کہ ان کا موقف ہے کہ حکومت غیر اسلامی بلکہ فاسق وفاجر ہے اور اس کے سارے اقدامات بھی غیر اسلامی ہیں ۔اسی لیے یہ سرکاری عدالتوں کی جج صاحبان کی طلاق کو جائز نہیں سمجھتے ۔اب اگر یہی غیر اسلامی حکومت کسی شیعہ مولوی کو طلاق کے صیغے پڑھنے کے لیے مقرر کر دے تو یہ تقرری بھی غیر اسلامی ہوگی کیونکہ ان کے مطابق یہ تقرری ایک غیر اسلامی بلکہ فاسق و فاجر حکومت کی طرف سے ہوگی اور اس حکومت کے مقرر کردہ مولوی کی دی ہوئی طلاق بھی عدالتی طلاق کی طرح غیر اسلامی ہوگی ۔ بالفاظ دیگر جس بنیاد پر مولوی صاحبان سرکاری عدالتوں کی دی ہوئی طلاق کو جائز نہیں سمجھتے ،حکومت کی طرف سے مقرر کردہ مولوی صاحب کی جاری کردہ طلاق کی بھی بالکل یہی حیثیت ہوگی ۔ان دونوں میں ذرا بھی فرق نہیں ہوگا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی کہ

فاسق وفاجر حکومت کا مقرر کیا ہوا جج طلاق دے تو طلاق نہیں ہوتی اور اسی فاسق وفاجر حکومت کا مقرر کیا ہوا مولوی طلاق دے دے تو وہ ہو جائے گی۔

سوال: مرد کی طرف سے دی گئی تحریری طلاق کی شرعی حیثیت؟

جواب: تحریری طور پر دی گئی طلاق بھی زبانی طلاق کی طرح مؤثر اور صحیح ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر دور، ہر قوم، ہر مذہب، ہر رنگ اور نسل کے عقلاء کے ہاں ہمیشہ تحریری بیان کو زبانی بیان سے زیادہ معتبر سمجھا گیا ہے اور اہم معاملات کو ہمیشہ ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

منّ الله علی الناس برهم و فاجرهم بالکتاب و الحساب ولولا ذالك لتغالطوا (کافی 155:5)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے نیک اور بدکار، سب لوگوں پر کتابت اور حساب کے ذریعے احسان کیا ہے، اگر یہ نہ ہوتے تو لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے۔

اس روایت سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تحریر اور کتابت شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں سے بچنے کا مؤثر ذریعہ ہے جسے امام علیہ السلام لوگوں پر اللہ کا احسان قرار دے رہے ہیں۔

لہٰذا اگر بعض روایات میں یہ ملتا ہے کہ تحریری طلاق واقع نہیں ہوتی تو ان روایات کو خلافِ عقل ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین جس طرح قرآن کے خلاف نہیں کوئی بات نہیں کر سکتے اسی طرح عقل کے خلاف بھی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اگر آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت دی جائے جو خلافِ عقل ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور اس بات میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں ہر انسانی معاشرے کے عقلاء کے ہاں تحریری بیان کو زبانی بیان سے زیادہ معتبر مانا گیا ہے۔

لہٰذا اگر باقی شرائط کے پورا ہوتے ہوئے مرد انگریزی، اردو یا کسی بھی زبان میں عورت کو تحریری طلاق دے دے تو طلاق ہو جاتی ہے۔

گواہی کے معاملہ میں ایک اہم نکتہ:

آخر پر گواہی کے حوالے سے ایک اہم بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سورہ طلاق میں طلاق کا حکم اس طرح سے دیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ۖ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا (1) فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ

ترجمہ: اے نبی! جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دو (یعنی اگر وہ عدت والی عورتیں ہوں تو اس طرح سے طلاق دو کہ وہ اپنی عدت کا حساب رکھ سکیں) اور عدت کو پوری طرح شمار کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے۔ (عدت کے دوران) انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود (عدت پوری کرنے سے پہلے شوہر کے گھر سے) نکل جائیں۔ ہاں! اگر وہ کھلم کھلا کسی گناہ کی مرتکب ہوں (تو اس صورت میں عدت کے دوران انہیں گھر سے نکالا جا سکتا ہے)، اور یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ تم نہیں جانتے لیکن عین ممکن ہے اس (طلاق) کے بعد (عدت کے دوران جب وہ شوہر کے گھر میں ہوں) اللہ کوئی نئی صورت پیدا کر دے (جس سے دونوں کے درمیان صلح اور موافقت پیدا ہو جائے۔) پھر جب وہ اپنی عدت کے اختتام کے نزدیک پہنچیں تو انہیں معروف کے مطابق روک لو یا معروف کے مطابق ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنوں میں سے دو عادل افراد کو گواہ بناؤ (یعنی طلاق کے وقت، اور اگر عدت کے دوران رجوع کر لو تو رجوع پر اور بصورت دیگر جدائی پر گواہ مقرر کر لو)۔ (طلاق: 1-2)

ان آیات میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ تین افعال کے بعد دو عادل افراد کو گواہ بنانے کا ذکر ہے۔ وہ تین افعال یہ ہیں:

(1) طلاق (2) عدت کے دوران رجوع (3) عدت کے اختتام پر علیحدگی

ان تین افعال کے بعد دو گواہوں کی گواہی کا حکم دینے کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ گواہی ان تینوں افعال پر ہوگی یا صرف آخری فعل پر۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ گواہی صرف طلاق کے ساتھ مخصوص ہو۔ اگر یہ طلاق کے ساتھ مخصوص ہوتی تو آیت اس طرح سے ہوتی:

ترجمہ: اے نبی! جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دو اور اپنوں میں سے دو عادل افراد کو گواہ بناؤ، اور عدت کو پوری طرح شمار کرو.......

لیکن آیت اس طرح سے نہیں ہے۔ بلکہ آیت کے مطابق طلاق دو گواہوں کی موجودگی میں دی جائے، عدت کے دوران مرد رجوع کر لے تو اس پر بھی دو عادل گواہوں کی گواہی ڈالی جائے، اگر مرد رجوع نہیں کرتا تو عدت کے خاتمہ پر عورت کو رخصت کرتے وقت بھی دو عادل گواہ موجود ہوں۔

لیکن ہمارے مجتہدین صرف طلاق کے وقت گواہوں کی موجودگی کو واجب جانتے ہیں اور رجوع اور عدت کے خاتمہ پر عورت کو رخصت کرنے پر گواہ مقرر کرنے کو واجب نہیں جانتے۔ مجتہدین کا یہ موقف واضح طور پر اس قرآنی حکم کے خلاف ہے۔ اس قسم کی خلاف ورزیوں کی اور بھی مثالیں ہمارے فقہاء کے فتاویٰ میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ مثالیں ایک الگ رسالہ میں آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی جس کا نام ہے:

فقہاء: قرآن کی عدالت میں

خلاصہ کلام

اگر کسی شیعہ عورت کا شوہر اس کے واجب اور جائز حقوق ادا نہ کرتا ہو اور عورت کی زندگی تکلیف دہ صورت اختیار کر لے اور وہ مرد عورت کے مطالبہ کے باوجود اسے خلع نہ دے تو اس صورت میں عورت حالتِ طہر میں معاشرے/ خاندان/ برادری کے دو معزز اور شریف انسانوں کے سامنے اپنی صورت حال واضح کرنے کے بعد اپنے نکاح کو ختم کرنے کا اعلان کر کے اس نکاح سے باہر نکل سکتی ہے۔

ایسا کرنے کی بجائے اگر عورت عدالت کے ذریعے خلع حاصل کر لے تو وہ بھی درست ہے اور اس کے بعد کسی مولوی سے صیغے پڑھوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

28-5-2019۔ لاہور۔

URL: www.drhamadani.com

E-mail: syedniazm@yahoo.com

www.facebook.com/Dr.NiazMuhammadHamadani

youtube: ayatullah dr syed niaz muhammad hamadani